قرآن کریم اور سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۷۹ شمارہ: ۵

جمادی الاولیٰ: ۱۴۳۷ھ - مارچ: ۲۰۱۶ء

قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے، زرِسالانہ: ۳۵۰ روپے

مدیر/ مدیر مسئول

مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر

نائب مدیر

مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون

مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

ناظم

مولانا فضل حق یوسفی

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات'' جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن

کراچی نمبر: 5، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465

فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 7-397-101900 برانچ کوڈ: 0816

مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، ناروے، ویسٹ انڈیز وغیرہ: 35 امریکی ڈالر

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان، ایران، انڈیا وغیرہ: 27 امریکی ڈالر

بنگلہ دیش: 25 امریکی ڈالر

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147

فیکس: +92-21-34919531

Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر **مطبع:** ایجوکیشنل پریس **طابع:** فیروز زکی

www.banuri.edu.pk

فہرست مضامین

بصائر وعبر

پاکستان کے خلاف اپنوں اور غیروں کے عزائم! ۳ محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات ومضامین

علاقائی ثقافتی میلے اور اسلام! ۹ محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ

جاوید احمد غامدی، سیاق وسباق کے آئینہ میں (قسط:۱۶) ۱۱ مولانا فضل محمد یوسف زئی

نظم وضبط کی اہمیت اسلامی تعلیمات کی روشنی میں! ۲۰ مولانا امداد اللہ یوسف زئی

مولانا، ملا اور مولوی کی اصطلاحات! ۲۷ مفتی رفیق احمد بالاکوٹی

حضرت مولانا محمد انور بدخشانی مدظلہٗ کے اہم علمی ملفوظات ۳۰ ضبط وترتیب: مولانا سفیان بلند

تزکیہ وتربیت سے خالی تعلیم کے نقصانات ۳۴ جناب عتیق الرحمٰن

اسلام میں یتیم ونادار بچوں کی کفالت ۳۷ مفتی محمد فیاض قاسمی (انڈیا)

بچوں کی پرورش سے متعلق احتیاط اور تدابیر ۴۰ مولانا محمد عاصم مخدوم

مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کی تاریخی خدمات (قسط:۱) ۴۲ مفتی محمد رضا انصاری

یادرفتگاں

حضرت مولانا عبدالرحیم بستویؒ استاذ دارالعلوم دیوبند کی رحلت ۴۷ مولانا عبدالرؤف غزنوی

دارالافتاء

آؤٹ سورسنگ (خدمات فراہم) کرنے والے

ادارے کی اجرت اور ابتداءً فارمولا طے کرنا! ۵۸ ادارہ

نقد ونظر

۶۱ ادارہ

www.banuri.edu.pk

پاکستان کے خلاف اپنوں اور غیروں کے عزائم!

الحمد للّٰہ وسلامٌ علٰی عبادہٖ الذین اصطفٰی

۹؍ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۰؍جنوری بروز بدھ صبح کے وقت دھند اور تاریکی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے دہشت گردوں نے باچا خان یونیورسٹی چارسدہ پر حملہ کرکے ایک پروفیسر، ایک گارڈ سمیت ۲۵؍افراد کو شہید اور چالیس سے زائد افراد کو زخمی کردیا۔ اس سانحہ پر پورا ملک سوگوار اور غم زدہ ہے۔ تمام دینی، مذہبی، سیاسی، سماجی اور عام افراد نے اس سانحہ کی مذمت کی اور اس سانحہ میں شہید ہونے والے طلبہ اور طالبات کے لواحقین کے غم کو اپنا غم سمجھا۔ یہ سانحہ آرمی پبلک اسکول پشاور کے سانحہ کے ٹھیک ایک سال ایک ماہ اور چار دن بعد برپا کیا گیا۔ سانحہ پشاور کے بعد ایک ایکشن پلان بنایا گیا، جسے وضع اور ساخت کے دن سے ہی اگرچہ متنازعہ رکھا گیا تھا، لیکن اس کے باوجود تمام مذہبی اور سیاسی جماعتوں نے اُسے قبول کیا، جس سے توقع ہوگئی تھی کہ شاید اس طرح دہشت گردی رُک جائے اور دہشت گردوں کو کیفر کردار تک پہنچایا جاسکے، لیکن ’’اے بسا آرزو کہ خاک شدہ‘‘ کا مصداق ابھی تک پاکستان میں نہ دہشت گردی رُکی ہے اور نہ ہی دہشت گردانہ کارروائیوں میں کوئی کمی آئی ہے۔

ذرائع ابلاغ تک رسائی رکھنے والے حضرات وخواتین جانتے ہیں کہ سانحہ چارسدہ سے چند دن پہلے بھارتی وزیر دفاع منوہر پاریکر نے بھارتی علاقہ پٹھان کوٹ کے واقعہ کے بعد کہا تھا کہ: ’’وہ اس حملے کا بدلہ پاکستان سے اس طرح لیں گے کہ اس کو دکھ پہنچے اور اس سال پاکستان کو سمجھ آجائے گا کہ بھارت دہشت گردی میں کہاں تک جاتا ہے۔‘‘

ادھر امریکی صدر باراک اوباما نے اسٹیٹ یونین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ: ’’پاکستان وافغانستان کئی عشروں تک عدم استحکام کا شکار رہیں گے۔‘‘

ایک وقت تھا کہ دنیا دو بلاکوں میں تقسیم تھی: ایک بلاک سوویت یونین کا تھا، جس کی باگ ڈور روس کے ہاتھ میں تھی اور وہ کئی ممالک کو اپنے شکنجے میں لیتے ہوئے افغانستان تک پہنچ چکا تھا اور دوسرا امریکی بلاک تھا، جس کی پیشوائی امریکہ کررہا تھا۔ روس کو شکست دینے کے لیے امریکہ نے پاکستان کو استعمال کیا، پاکستان نے افغانستان میں برپا رُوسی جنگ کو اپنی جنگ قرار دیا اور ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا، جس سے روس کو عبرتناک شکست ہوئی۔

دو بلاکوں کی تقسیم ختم ہونے اور امریکہ کے فاتح وسپر پاور بننے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ امریکہ ہو یا افغانستان ہر دو ملک پاکستان کے احسان مند ہوتے، اس کے معاشی اور اقتصادی نقصانات کے ازالہ کی کوشش کرتے اور پاکستان کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے لیے ہر ممکن تعاون مہیا کرتے، لیکن اس کے برعکس آج افغانستان کی سرزمین پاکستان کو کمزور کرنے کے لیے استعمال ہورہی ہے اور امریکہ بہادر بجائے اس دہشت گردی کی مذمت کرنے اور اس کے کرداروں پر قدغن لگانے کے اُلٹا یہ دھمکی دے رہا ہے کہ پاکستان کئی عشروں تک عدم استحکام کا شکار رہے گا۔ بقول ایک صحافی بھائی کے کہ: سچ تو یہ ہے کہ وہ (امریکی صدر) کوئی پیشن گوئی نہیں کررہے، بلکہ اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے پاکستان کو عدم استحکام کا شکار کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

پاکستان ہو یا افغانستان، ترکی ہو یا شام، سعودی عرب ہو یا ایران، ہر جگہ فتنہ وفساد، قتل وغارت اور ایک دوسرے کے خلاف دھمکی آمیز بیانات یہ سب کچھ کیوں ہورہا ہے؟ اور کہاں سے ہورہا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے روزنامہ جنگ کے مشہور کالم نگار محترم جناب نصرت مرزا صاحب کے کالم بنام ’’پاکستان حملوں کی زَد میں‘‘ کے چند اقتباسات کا پڑھنا ضروری ہے، موصوف لکھتے ہیں:

’’یہاں بھارت اور امریکہ کے علاوہ افغانستان کے کچھ عناصر سمیت کئی دوسرے ملکوں کا پاکستان کے خلاف مورچہ بنانے کا پروگرام ہے، اس لیے پاکستان‘ پاک چین اقتصادی راہداری بنارہا ہے، جس سے اس کی معاشی حالت بدل جائے گی، وہ اسٹرٹیجک خودمختاری اور اسٹرٹیجک کمپاس بناڈالے گا کہ اپنی مرضی سے کس سے دوستی کرے اور کس کو سزا دے۔ اس کے مقابلے میں بھارت خود کو سپر طاقت سمجھ رہا ہے کہ پاکستان کو کھلے عام اور اعلان کرکے نقصان پہنچانے کی بات کررہا ہے۔ بھارت نے پاکستان اور افغانستان میں پنجے گاڑلیے ہیں اور اپنا دہشت گردی کا نیٹ ورک منظّم کرلیا ہے۔ بھارت کے سلامتی امور کے مشیر اجیت ڈول یہ کہتے

سنے گئے کہ وہ چین پاکستان اقتصادی راہداری نہیں بننے دیں گے، چاہے اس کے لیے انہیں داعش سے مدد ہی کیوں نہ لینا پڑے، وہ مدد شاید انہوں نے حاصل کرلی ہے، اس کے ساتھ ساتھ پاکستان نے سعودی عرب اور ایران کے درمیان صلح کرانے کی مہم شروع کررکھی ہے جس سے امریکہ، بھارت اور دنیا کے کئی ممالک ناراض ہیں۔ ترکی نے ایسا کرنے کا کہا ہی تھا کہ اس کے ملک میں خودکش حملہ ہوگیا، انڈونیشا نے بھی ابھی یہ بات کہی ہی تھی کہ وہ مصالحتی کردار ادا کرنے کو تیار ہے تو اس کے ملک میں اقوام متحدہ کے دفتر پر حملہ ہوگیا، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایران اور سعودی عرب کے درمیان کشیدگی پھیلانا اور ان کو حالت جنگ میں لانا امریکی ومغربی منصوبہ ہے۔ اس لیے جو کوئی بھی اس میں ہاتھ ڈالتا ہے، اس کے ہاتھ جلا دیئے جاتے ہیں۔ پاکستان کے وزیر اعظم اپنے ہمراہ آرمی چیف جنرل راحیل شریف کو لے کر اس مشن پر نکل پڑے اور تابڑتوڑ حملے شروع ہوگئے۔ یہ اس لیے نہیں ہوئے ہیں کہ ضرب عضب کام نہیں کررہا، بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ دشمنوں نے اپنی کارروائیاں بڑھادی ہیں، وہ افغانستان میں محفوظ پناہ گاہوں میں بیٹھ کر منصوبہ بندی کرتے ہیں اور پاکستان کی کمزور جگہوں پر حملہ کرتے ہیں۔ اسکولوں، یونیورسٹی پر حملہ کرنا شرمناک ہے اور یہ دہشت گرد یہ سب اسلام کے نام پر کرتے ہیں۔ اچھا ہے کہ اب علمائے کرام نے کھل کر ان کی مخالفت شروع کردی ہے۔ سوال یہ ہے کہ پاکستان میں دہشت گردوں میں تیزی کیا اس وجہ سے آئی ہے کہ بھارت پٹھان کوٹ کا بدلہ لے یا پھر چین پاکستان اقتصادی راہداری میں رکاوٹ ڈالنا ہے یا پھر مصالحت کرانے کی کوشش کا شاخسانہ یا وہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے درپے ہیں۔ ہمارے خیال سے یہ ساری باتیں یکجا ہوگئی ہیں۔''

(روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۵/جنوری ۲۰۱۶ء)

....

دہشت گردوں کی ان بزدلانہ کارروائیوں کی بنا پر انتظامیہ نے ملک بھر کے تمام عصری وتعلیمی اداروں میں دہشت گردوں سے نمٹنے اور ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے اساتذہ کو مسلح ہونے، اسلحہ چلانے اور طلبہ کو دہشت گردوں سے بچنے کا طریقہ سکھلانے کے نام پر خوف وہراس پھیلا دیا ہے، جس سے طلبہ خوف زدہ اور ذہنی طور پر بہت زیادہ پریشان اور ماؤف نظر آتے ہیں۔

سوچنے کی بات ہے کہ جب ایک استاذ یا ایک طالب علم ذہنی طور پر پریشان ہوگا یا اس پر کوئی خوف طاری ہوگا تو وہ کس طرح پڑھا پائے گا یا پڑھ پائے گا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اپنے ان بچوں اور طلبہ کو تسلی دیتے، ان کو حوصلہ دیتے کہ دشمن کمزور ہورہا ہے، وہ اپنی جنگ ہار چکا ہے، جس کی بنا پر وہ جاتے جاتے ان

اوچھے ہتھکنڈوں کو آزمارہا ہے، اس لیے آپ سب کو بہادر بننے کی ضرورت ہے، ہم اور آپ ملک کر ان دہشت گردوں کوشکست دے سکتے ہیں۔ وزیرداخلہ محترم جناب چوہدری نثارعلی خان نے درست فرمایا ہے کہ:

''دہشت گردی کے خلاف بندوق کی جنگ تو سیکورٹی اداروں کی کاوشوں سے جیت رہے ہیں، لیکن نفسیاتی طور پر ہاررہے ہیں۔ پنجاب میں اسکول بند کر کے دہشت گردوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ خیبرپختون خوا نے اسکول بند نہ کر کے اچھی مثال قائم کی۔'' (روزنامہ جنگ کراچی، ۲۹/جنوری ۲۰۱۶ء)

....

ملکی اخبارات اورسوشل میڈیا میں یہ خبر آئی ہے کہ پنجاب حکومت نے تبلیغی جماعت کی دعوت وتبلیغ پر تعلیمی اداروں میں پابندی لگادی ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ دہشت گرد تبلیغی جماعت کے روپ میں ان اداروں میں گھس کر کارروائی کر سکتے ہیں۔

زمانہ اس قدر قائل ہوا ہے فیض جھوٹوں کا
جو سچ کہتے ہیں ان کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

تبلیغی جماعت کوئی ایسی جماعت نہیں جس کی کارکردگی مخفی ہو یا ان کے ایسے عزائم ہوں جو کسی کو معلوم نہ ہوں۔ پوری دنیا جانتی ہے کہ یہ پرامن جماعت ہے جواللہ تعالیٰ کے بندوں کواللہ تعالیٰ کی بندگی کی دعوت دیتی ہے اور پوری دنیا کے انسانوں کے لیے وہ فکر کرتی ہے، وہ تو لوگوں کو کہتے ہیں کہ ہم سب کی دنیا اور آخرت کی پوری کی پوری کامیابی اللہ تعالیٰ کے احکامات ماننے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقوں کواپنانے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات اورخاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے ہماری زندگی میں کس طرح آئیں گے؟ اس کے لیے ایک محنت کی ضرورت ہے۔ اورمزید یہ کہ ان کی دعوت وتبلیغ کے نام پر محنت چھ نمبروں میں دائر رہتی ہے: ۱:.....کلمہ طیبہ، ۲:.....علم، ۳:.....نماز، ۴:.....ذکر، ۵:.....اکرام مسلم، ۶:.....دعوت وتبلیغ۔ پھر ہر ایک کے فضائل بتائے اور سنائے جاتے ہیں، جس سے آدمی برضا ورغبت اپنی خوشی سے اس محنت کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ راہِ راست سے دور کتنا لوگ ان کی دعوت سے راہِ راست پر آ گئے، بے نمازی' نمازی بن گئے، لٹیرے' امانت داربن گئے، راہزن' راہبر بن گئے، جن کی مثالیں دینا شروع کریں تو کئی دفتر اور رجسٹر بھر جائیں گے۔

دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کے نام پر جاری جنگ میں کسی کافر سے کافر ملک نے بھی تبلیغی جماعت پر یہ الزام نہیں لگایا کہ یہ منافرت پھیلاتے ہیں اور پاکستان بھر میں بھی کسی عقیدہ اور مسلک والے نے آج تک علانیہ تبلیغی جماعت کے بارہ میں یہ نہیں کہا کہ یہ فرقہ واریت

پھیلاتے ہیں، مسلکی منافرت پھیلاتے ہیں یا ہمارے عقیدہ پر یہ تنقید کرتے ہیں۔ تبلیغی احباب تو حتی الوسع دینی مسائل تک بتانے سے احتراز کرتے ہیں کہ اس سے دعوت والے کام میں فرق آتا ہے، لیکن آج مسلم لیگ کی پنجاب حکومت یہ کارنامہ سرانجام دے رہی ہے کہ تبلیغی جماعت پر پابندی لگا رہی ہے۔

ہر باشعور اور دانشمند آدمی سمجھتا ہے کہ یہ لبرل پاکستان بنانے کی بھونڈی کوشش ہے، جسے ایک عرصہ سے دھیرے دھیرے آگے بڑھایا جارہا ہے اور یوں لگ رہا ہے کہ بیوروکریسی اور نوکرشاہی میں ایسے بے دین، بدعقیدہ، قادیانی اور ملحد لوگ ''حکومتی شریفوں'' پر حاوی ہو چکے ہیں جو انہیں دین کے خلاف، دینی جماعتوں کے خلاف، مسجد اور مدرسہ میں دینی تعلیم وتعلم میں مصروف طلبہ، علماء اور محبّ دین عوام کے خلاف بھڑکا اور اُبھار رہے ہیں۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ ان اوچھے ہتھکنڈوں سے دین کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، اس لیے کہ یہ دین تو اللہ تعالیٰ کا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔ اس نے فرعون کے خلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کھڑا کیا۔ نمرود کے مقابلہ میں ایک مچھر سے کام لیا۔ بیت اللہ کی حفاظت ابابیلوں سے کرائی۔ دور کیوں جایئے! محترم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی حمایت کرنے والے قادیانیوں کے خلاف اللہ تعالیٰ نے بھٹو مرحوم سے ہی کام لیا اور ان کو پاکستانی دستور میں غیر مسلم اقلیت قرار دیا، لیکن دین کے خلاف کام کرنے والے ضرور عبرت کا نشان بنتے رہے ہیں اور بنتے رہیں گے۔ یوں لگ رہا ہے کہ جس طرح بیرونی ہاتھ اور ان کے آلۂ کار پاکستان کو غیر مستحکم کرنے اور اس کی سرحدوں کو غیر محفوظ کرنے کی کوششوں میں ہیں، اسی طرح یہ غیر مرئی اندرونی ہاتھ بھی پاکستان کو خلفشار اور ہیجان کی کیفیت میں مبتلا کرنے اور اس کے اسلامی تشخص کو مٹانے کے درپے ہیں۔ یہ صرف ہماری رائے نہیں، بلکہ ہر سنجیدہ اور باشعور آدمی ان حکومتی اقدامات سے یہی تأثر لے رہا ہے، چنانچہ جمعیت علمائے اسلام کے امیر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب حفظہ اللہ نے حالات کی صحیح عکاسی اور حکومتی عزائم سے پردہ اُٹھاتے ہوئے درست فرمایا ہے کہ حکومتی ادارے یہ چاہتے ہیں کہ مولوی جذباتی ہوکر کوئی ایسا اقدام کریں کہ وہ قانون کے شکنجے میں آجائیں، اس بیان کی مزید وضاحت درج ذیل خبر میں ملاحظہ فرمائیں:

''اسلام آباد (ایجنسیاں) جمعیت علماء اسلام (ف) کے سربراہ مولانا فضل الرحمٰن نے کہا ہے کہ ایران سعودی عرب تنازع میں پاکستان کا کردار غیر جانبدارانہ ہے، ہم کسی بھی صورت اس جنگ کے حق میں نہیں ہیں، مگر حرمین شریفین کی طرف بڑھنے والے ہاتھوں کو کاٹ دیا جائے گا۔ نیشنل ایکشن پلان پر تحفظات کا اظہار کیا تھا، مگر کسی نے کان نہیں دھرے، ملک میں امن کے لیے ایکشن پلان کی حمایت کی، مسلمان ملکوں میں جان بوجھ کر حالات خراب کیے جارہے ہیں۔ مساجد اور مدارس پر چھاپے مارکر کس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی

www.banuri.edu.pk

جارہی ہے؟ صاف صاف بتادیا جائے کہ ہمیں مدارس نہیں چاہئیں۔ دہشت گردی کے خلاف طاقت استعمال کرنے کے فلسفے پر نظرثانی کرنا ہوگی۔ جامعہ حفصہ کو مسئلہ بناکر مدارس اور مساجد کو نشانہ بنایا جارہا ہے، ہم جہاد والا اسلام نہیں مانگ رہے، ہمیں جمہوریت والا اسلام چاہیے۔ ادارے چاہتے ہیں کہ مولوی جذباتی ہوجائیں اور قانون کے شکنجے میں آجائیں۔ تبلیغی جماعت پر پابندی مضحکہ خیز ہے، ایسا تو مارشل لاء میں بھی نہیں ہوا، کچھ قوتیں ملکی حالات خراب کررہی ہیں ....معاملات کو اگر تدبر کے ساتھ سلجھایا جائے تو بہتر ہے، جنگ مسائل کا حل نہیں ہے، پوری دنیا میں مسلمانوں کو صرف اس لیے نشانہ بنایا جارہا ہے کہ طاغوتی طاقتیں اسلام سے خائف ہیں۔ سعودی عرب ایران جنگ کے مخالف ہیں اور پاکستان کے ثالثی کے کردار کو سراہتے ہیں۔ پاکستان میں مذہبی لوگوں کو لڑایا جارہا ہے، محرم اور ربیع الاول کے جلوسوں کے حوالے سے نئی قانون سازی ضروری ہے، مگر بعض ایسی قوتیں جو درپردہ بیرونی آلۂ کار ہیں وہ کسی صورت پاکستان میں مذہبی رواداری کے حق میں نہیں ہیں، جس میں بعض ہمارے اپنے لوگ بھی شامل ہیں جو فرقہ واریت کو پروان چڑھاکر ایک مذہبی طبقے کو دوسرے مذہبی طبقے کے سامنے کھڑا کررہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مغرب کے مفاداتی نظام کی ترجیحات بدل گئی ہیں، ۹۰ء کی دہائی کے بعد سیاسی مخالفوں کو پکڑ کر ان پر مالی بدعنوانی کا الزام لگادیا جاتا تھا، اسی لیے نائن الیون کے بعد جس کو بھی پکڑا گیا اس پر دہشت گردی کا لیبل لگادیا گیا، جس کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہوا، مدارس، مساجد اور علماء کو نشانہ بنایا گیا اور اب پھر مساجد اور علماء کو نشانہ بنانے کی باتیں ہورہی ہیں۔ کچھ قوتیں ملک کے حالات خراب کررہی ہیں، جامعہ حفصہ جیسے مسائل دینی مدارس کو پیچھے دھکیلنے کے لیے کھڑے کیے جاتے ہیں، ملک میں مسلح جماعتیں موجود ہیں، لیکن امن کے نام پر مدارس کے تقدس کو پامال کیا جارہا ہے۔ (روزنامہ جنگ کراچی، پیر، یکم فروری ۲۰۱۶ء)

خلاصہ یہ کہ پاکستان غیروں اور اپنوں کے نشانے پر ہے اور پاکستان کے اسلامی تشخص کو مٹانے کی کوششیں کی جارہی ہیں، لیکن ان شاء اللہ! دینی طبقہ اور پاکستانی عوام بھی متحد ہوکر اپنی افواج کے شانہ بشانہ اپنے وطن کے ایک ایک چپہ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ پاکستان کے اسلامی تشخص کی بھی حفاظت کریں گے اور کسی پاکستان دشمن اور دین دشمن کو ان ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین

علاقائی ثقافتی میلے اور اسلام!

محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

یکم دسمبر سے کراچی میں ایک ثقافتی میلہ منعقد کیا جارہا ہے جس میں سندھی، پنجابی، پٹھانی اور بلوچی ثقافتوں کی نمائش کی جائے گی۔ اسلامی لغت ''ثقافت'' کے لفظ سے نا آشنا ہے۔ قرآن کریم، حدیث نبوی اور دیگر اسلامی ذخائر میں یہ لفظ کہیں نہیں ملتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد مکارمِ اخلاق کی تکمیل قرار دیا، مگر یہ کہیں نہیں فرمایا کہ میں ''ثقافت'' کی تعلیم کے لیے آیا ہوں۔

دراصل انگریزی میں ''کلچر'' کا لفظ تہذیب وتمدن اور اسلوبِ زندگی کے معنی میں رائج تھا۔ ہمارے عرب اُدباء نے اس کا ترجمہ ''ثقافت'' سے کرڈالا اور جب سے یہ لفظ مسلمانوں میں کثرت سے استعمال ہونے لگا، مگر یہ مہمل لفظ آج تک شرمندۂ مفہوم ومعنی نہیں ہوا۔ ہر شخص نے اپنے ذوق کے مطابق اس کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی اور آج کل عموماً اُسے رقص وسرود، ناچ رنگ، فحاشی اور عیاشی کے مناظر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ خیر! کچھ بھی ہو، کہنے کی بات یہ ہے کہ اس اسلامی ملک میں ان علاقائی ثقافتوں کی ترویج ونمائش اور حوصلہ افزائی کا کیا مقصد ہے؟ ''سندھی ثقافت'' آخر کیا بلا ہے؟ اس سے مراد محمد بن قاسمؒ کی ثقافت ہے یا راجہ داہر کی؟ ''پنجابی ثقافت'' کیا چیز ہے؟ کیا راجہ اجیت سنگھ کی ثقافت کا احیا مقصود ہے؟

''سندھی'' ایک مسلمان بھی ہوسکتا ہے اور کافر بھی۔ ''پنجابی'' ایک مومن بھی ہوسکتا ہے اور ایک سکھ بھی۔ ''بلوچی'' بھی ایک مسلم بھی ہوسکتا ہے اور ایک یہودی بھی۔ جب آپ سندھی، پنجابی اور بلوچی ثقافتوں کی نمائش کریں گے تو وہ ایک مسلم وکافر کی مشترکہ میراث ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان کو بحیثیت مسلمان کے اس سے کیا دلچسپی ہے؟ کیا پاکستان انہی چیزوں کو نمایاں کرنے کے لیے بنایا گیا، جن میں دنیا بھر کے کافروں کی تسلی کا سامان تو ہو، مگر اسلام اور مسلمانوں کو ان سے کوئی واسطہ نہ ہو؟

اگر یہ ایک اسلامی ملک ہے اور یہاں کے شہری مسلمان ہیں تو ان سب کے لیے ایک ہی

ثقافت ہوسکتی ہے: قرآن حکیم کی تعلیمات اور آنحضرت ﷺ کا اسوۂ حسنہ۔ عقل وایمان کا یہ کیسا المیہ ہے کہ اسلام، اسلامی تعلیمات اور اسوۂ نبوی کی کسی کو فکر نہیں، مسلمانوں کے اخلاق ومعاشرت کی اصلاح کی طرف کسی کو توجہ نہیں اور زندہ کیا جارہا ہے تو ان تہذیبوں کو؟ اس کے لیے ہزاروں، لاکھوں روپیہ اس مفلس ملک اور بے بس قوم کا صرف کیا جارہا ہے۔

اور یہ بات بھی شاید ہمارے اربابِ حل وعقد کے سوا کسی کی عقل میں نہیں آئے گی کہ ایک طرف تو زبانی جمع خرچ کے طور پر چاروں صوبوں کے درمیان اتفاق واتحاد کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے، علاقائی عصبیت پھیلانے والوں کو ملک وملت اور قوم ووطن کے غدار کے خطاب سے نوازا جاتا ہے، اور دوسری طرف ہزاروں روپیہ خرچ کر کے علاقائی ثقافتوں کو ابھار کر علاقائی عصبیت کی چنگاری کو ہوا دی جاتی ہے۔ ان سندھی، پنجابی، پٹھانی، بلوچی ثقافتوں کو جب اچھالا جائے گا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ لوگوں میں سندھیت اور پنجابیت، پشتونیت اور بلوچیت کا احساس ابھرے گا، صوبوں کے درمیان منافست اور منافرت بیدار ہوگی اور علاقائی عصبیت کا بھوت عریاں رقص کرنے لگے گا۔ ایک وطن، ایک قوم، ایک ملت اور ایک مقصد کا احساس اگر کسی کے گوشۂ قلب میں موجود ہو تو وہ بھی دب کر رہ جائے گا۔ کہیں یہ ثقافتی میلے، یہ علاقائی ناچ رنگ کی نمائش، ملک کے مزید حصے بخرے کرنے کی سازش تو نہیں؟ کیا یہ مسلمانوں میں مزید جنگ وجدال برپا کرنے کی تمہید تو نہیں؟

ان علاقائی ثقافتی میلوں کا ایک اور دردناک پہلو بھی نہایت اہم ہے۔ اس وقت پورا ملک ہوشربا گرانی اور قلتِ رسد کی لپیٹ میں ہے۔ پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے بعض علاقوں میں قحط کے سے آثار نمودار ہورہے ہیں، لوگوں کو ستر پوشی کے لیے کپڑا اور جسم وجان کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے قوت لایموت کا حصول بھی مشکل ہورہا ہے، خشک سالی نے آئندہ فصل کے لیے بھی بیم وخوف کی شکل پیدا کردی ہے، بجلی اور پانی کی قلت سے زمین بنجر اور کھڑی فصلیں خشک ہورہی ہیں، حالات کے دباؤ نے لوگوں میں اندیشہ ہائے دور ودراز پیدا کردیئے ہیں، ہر شخص فکرمند نظر آتا ہے۔

اگر کسی کے دل میں رحم وانصاف کی کوئی رمق ہو تو اُسے سوچنا چاہیے کہ ان سنگین حالات میں یہ ملک ان ثقافتی عیاشیوں کا متحمل ہے؟ ان حالات میں توبہ واستغفار اور انابت الی اللہ کی ضرورت ہے یا ان مختلف علاقوں کے ناچ رنگ کے ڈراموں کی؟

خدارا! اس ملک پر رحم کیجئے! اس قوم پر رحم کیجئے! قوم وملک کو ان لعنتوں میں گرفتار کر کے خدا کے غضب کو دعوت نہ دیجئے! اگر اسلامی ملک کی اصلاح وفلاح اور مسلمانوں کے امن وسکون کے اسباب مہیا کرنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے تو کم از کم اُنہیں تباہی وبربادی کے جہنم میں تو نہ دھکیلئے:

''مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں''

جاوید احمد غامدی

مولانا فضل محمد یوسف زئی

سیاق وسباق کے آئینہ میں (سولھویں اور آخری قسط)

جاوید احمد غامدی صاحب کا قلم

جاوید احمد غامدی صاحب ایک قادر الکلام صاحب قلم اسکالر ہیں۔ ادبی شہہ پاروں کے ضمن میں تلمیحات واشارات اور طنز وتشریحات وتاویلات کے اچھے خاصے ماہر ہیں۔ اپنے اس فن کے داؤ پیچ میں وہ کبھی مخاطب کو اچھی خاصی گالی دے جاتے ہیں، مگر قلم کی صفائی سے کسی کو احساس نہیں ہونے دیتے۔ میں غامدی صاحب کے چند چیدہ چیدہ کلمات ان کی کتابوں سے چن کر قارئین کے سامنے رکھتا ہوں اور اپنے مخاطبین کو یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ جاوید غامدی صاحب کے خلاف اگر کہیں کسی کے قلم میں سختی دکھائی دیتی ہے تو وہ اسی کے قلم کے عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔

حضرت ماعز رضی اللہ عنہ جاوید غامدی کے قلم کی زَد میں

جناب غامدی صاحب کے صحابی رسول کی تحقیر وتوہین کے کلمات سے پہلے ایک ضابطہ اور قاعدہ سمجھ لینا چاہیے، وہ یہ ہے کہ تکمیل شریعت کے لیے اور امت کو شریعت کا عملی نمونہ دکھانے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام اعمال وافعال پر خود عمل فرمایا ہے جو اعمال وافعال عصمت نبوت کے منافی نہیں تھے، اگرچہ عام ماحول میں وہ بہت ہی ناآشنا اور ثقیل سمجھے جاتے تھے، جیسے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح کرنے کو عرب جاہلیت میں حرام سمجھتے تھے، چنانچہ اس رسم کو توڑنے کے لیے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی مطلقہ بیوی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کر کے عرب جاہلیت کے ایک سخت ترین رواج کو توڑ ڈالا۔ یہ فعل چونکہ عصمت انبیاء کے منافی نہیں تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات مبارک کو اس کے توڑنے کے لیے پیش فرمایا۔ لیکن بعض افعال واعمال ایسے تھے کہ تکمیل شریعت کے لیے اس کا نمونہ پیش کرنا اگرچہ ضروری تھا، جیسے چوری کی پاداش میں ہاتھ کٹ جانا، زنا کی پاداش میں شادی شدہ کے لیے سنگسار ہوجانا، شراب پینے پر اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا دینا، حد قذف میں اسی (۸۰)

کوڑے کھانا، یہ ایسے افعال تھے جن کا ارتکاب شانِ نبوت اور عصمتِ انبیاء کے خلاف تھا، آنحضرت ﷺ اس کا نمونہ خود پیش نہیں کر سکتے تھے اور تکمیل شریعت کے لیے اس کا عملی نمونہ نہایت ضروری تھا، اس لیے تکوینی طور پر بعض صحابہؓ اور بعض صحابیاتؓ سے ایسے افعال سرزد ہوگئے جن پر حد نافذ ہوگئی اور امت کو شریعتِ مقدسہ کا ایک عملی نمونہ مل گیا کہ شادی شدہ مرد کو اس طرح سنگسار کیا جاتا ہے، زانیہ عورت کو اس طرح سنگسار کیا جاتا ہے، غیر شادی شدہ مرد وعورت کو حد زنا، حد خمر اور حد قذف میں اس طرح کوڑے مارے جاتے ہیں، چور اور چورنی کا ہاتھ اس طرح کاٹا جاتا ہے، چنانچہ ان سزا یافتہ صحابہؓ وصحابیاتؓ کی یہ بڑی قربانی تھی، جنہوں نے گویا تکمیل شریعت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا، جس سے اسلامی شریعت کی تکمیل ہوگئی۔ اس پیارے منظر نامے سے ان سزا یافتہ صحابہؓ وصحابیاتؓ سے امت کے ہر سننے پڑھنے والے کے دل میں محبت اور عقیدت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں جب حدیث میں ان حضرات کے اخلاص پر مبنی ان احادیث کو پڑھاتا ہوں تو بے اختیار خود بھی روتا ہوں اور طلبہ بھی روتے ہیں، اس کے برعکس جاوید غامدی صاحب نے ان صحابہؓ وصحابیاتؓ کو ”غنڈے، اوباش، بدترین اشخاص، بڑے بدمعاش، بدترین اوباش، انتہائی بدخصلت غنڈے، جنسی ہیجان کے غلبہ میں مہینوں عورتوں کا پیچھا کرنے والے“ جیسے ناموں سے اپنی کتاب برہان میں یاد کیا ہے۔ (دیکھئے: برہان، ص:۸۳تا۹۱،طبع:ہفتم، دسمبر۲۰۰۹ء)

غامدی صاحب نے صحابہ کرامؓ کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اس سے ان صحابہؓ سے دلوں میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور آنحضرت ﷺ نے جو اُن کی مدح فرمائی ہے اور ان کے لیے جنت کی بشارت سنائی ہے، وہ سب مشکوک ہو جاتے ہیں۔ جن شارحین حدیث اور محدثین وفقہاء اور مدارس کے علماء نے ان صحابہؓ وصحابیاتؓ کے خلوص اور خوفِ آخرت اور گناہ پر ندامت اور نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ان کے لیے جنت کی بشارت اور توبہ کی عظیم قبولیت کو بیان کیا ہے، ان تمام چیزوں کو جاوید احمد غامدی نے نہایت چالاکی سے رد کیا ہے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ جاوید غامدی، ان کے استاد امین اصلاحی اور ان کے استاد حمید الدین فراہی رجم کی سزا کو نہیں مانتے، وہ کہتے ہیں کہ زانی کے لیے قرآن میں صرف کوڑے ہیں، خواہ زانی شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ہو اور رجم کی احادیث سب غلط اور ناقابل اعتبار ہیں۔ اُدھر احادیث کی کتابوں بخاری ومسلم اور صحاحِ ستہ سے ثابت ہے کہ عہد نبوی میں رجم کے کئی واقعات پیش آئے ہیں، جو تواتر عملی اور اجماعِ صحابہؓ سے ثابت شدہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے، رجم کی سزا سے انکار وفرار کی وجہ سے غامدی صاحب، ان کے استاد امین احسن اصلاحی اور ان کے استاد حمید الدین فراہی صاحب نے ان واقعات کو ”فساد فی الارض“ قرار دیا اور پھر ان صحابہؓ وصحابیاتؓ پر فساد فی الارض اور بغاوت ومحاربہ کا دفعہ چسپاں کر دیا۔ بہرحال غامدی صاحب کی لمبی عبارت ملاحظہ کیجئے اور فیصلہ فرمائیں کہ صحابہؓ کے بارے میں ان کا اخلاقی معیار کس پیمانے پر ہے، برہان، ص:۸۳ طبع: ہفتم، دسمبر ۲۰۰۹ء میں غامدی

صاحب صحابیِ رسول حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس میں شبہ نہیں کہ ماعز رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ سب باتیں حدیث کی کتابوں میں بیان ہوئی ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر اس کے اس کردار کی نفی کی جاسکے جو حضور ﷺ کی تقریر سے نمایاں ہوتا ہے۔ اعترافِ جرم اور ندامت سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ یہ کوئی مردِ صالح تھا جس سے یہ جرم اتفاقاً سرزد ہوگیا۔ دنیا میں جرائم کی جو تاریخ اب تک رقم ہوئی ہے، اس سے دسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ بدترین اوباش اور انتہائی بدخصلت غنڈے جو کسی طرح گرفت میں نہیں آسکتے تھے، ارتکابِ جرم کے فوراً بعد کسی وقت اس طرح قانون کے سامنے خود پیش ہوئے کہ ان کی ندامت پر لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے ہمدردی کے جذبات اُمڈ آئے۔ نفسیاتِ جرم کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے محرکات کئی ہوسکتے ہیں: مجرم اس اندیشے میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ اب یہ جرم چھپا نہ رہے گا، اس لیے وہ خود آگے بڑھ کر اس خیال سے اپنے آپ کو قانون کے سامنے پیش کر دیتا ہے کہ اس طرح شاید اُسے سخت سزا نہ دی جائے۔ جرم اس طریقے سے سرزد ہوتا ہے کہ اس کے افشاء کو روکنا فی الواقع ممکن نہیں رہتا، چنانچہ وہ سبقت کر کے اپنے آپ کو لوگوں کے ردعمل کی شدت سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ جنسی ہیجان کے غلبہ میں مہینوں عورتوں کا پیچھا کرنے والے جب پہلی مرتبہ زنا بالجبر کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں تو بعض اوقات اس جرم کے نتیجے میں ہیجان کا ختم ہوجانا ہی انہیں اعترافِ جرم پر آمادہ کر دیتا ہے۔ مجرم کے ماحول میں کسی غیر معمولی دینی شخصیت کا وجود بھی اس کا باعث بن جاتا ہے، جرم کے حالات' مثلاً مجرم کی درندگی کا شکار ہونے والی عورت یا بچے کی بے بسی بھی یہ نتیجہ پیدا کر دیتی ہے۔ ضمیر کی خلش اور انسان کے اندر سے نفس لوامہ کی سرزنش بھی صرف بھولے بھالے مجرموں ہی میں احساسِ ندامت پیدا کرنے کا باعث نہیں بنتی، بڑے بڑے بدمعاش بھی بعض اوقات کسی خاص صورت حال میں اس سے متنبہ ہوجاتے ہیں اور پھر پورے خلوص کے ساتھ نہ صرف یہ اپنے جرم کا اعتراف کر لیتے ہیں، بلکہ اصرار کرتے ہیں کہ اُنہیں جلد سے جلد کیفر کردار کو پہنچا دیا جائے۔ پروردگار اسے جنت میں بھی داخل کرسکتا ہے، اللہ کا رسول اگر دنیا میں موجود ہو اور اسے وحی کے ذریعے یہ بتایا جائے کہ مجرم کی مغفرت ہوگئی اور یہ معلوم ہوجانے کے بعد اس کی نماز جنازہ پڑھے اور لوگوں کو بھی اس کے حق میں دعا کی نصیحت کرے تو اس سے اس کردار کی نفی کس طرح ہوجائے گی جو توبہ و اصلاح سے پہلے اس مجرم کا رہا؟ اس سے کیا یہ سمجھا جائے کہ کسی اوباش کو کبھی توبہ کی توفیق نہیں ملتی؟ اور جو شخص توبہ کرلے، اس کے بارے میں یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کبھی اوباش بھی رہا تھا؟ اسی طرح یہ بات تو بے شک صحیح ہے کہ کسی بدترین شخص کا ذکر بھی اس کے مرجانے کے بعد کبھی برے لفظوں میں نہیں کرنا چاہیے اور رسول اللہ ﷺ نے اسی بنا پر ان لوگوں کو تنبیہ کی جو ماعز رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ کہہ رہے تھے کہ اس کی شامت نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ کتے کی طرح سنگسار کر دیا گیا، لیکن اس کے معنی کیا یہ ہیں کہ جس شخص کے بارے میں بغیر کسی ضرورت کے اس طرح کا تبصرہ کرنے سے

لوگوں کو روکا جائے، وہ لازماً کوئی ہستی معصوم ہی ہوتا ہے؟ اور قانون وشریعت کی تحقیق کے لیے بھی اس کا کردار کبھی زیرِ بحث نہیں لایا جاسکتا؟ رہی یہ بات کہ حضور ﷺ نے اس سے مثلاً اس طرح کے سوالات کیے کہ کیا تم جانتے ہو کہ زنا کیا ہے؟ تو یہ وہ سوالات ہیں جو اعترافِ جرم کی صورت میں ہر عدالت کو لازماً کرنے چاہئیں، اس صورت میں چونکہ اس بات کا ہر وقت امکان ہوتا ہے کہ بعد میں کوئی شخص مجرم کے کسی مبہم بیان کی بنا پر عدالت کے فیصلے پر معترض ہو اور مدینہ کے ماحول میں جہاں منافقین صبح وشام اسی طرح کے فتنوں کے لیے سرگرم رہتے تھے، اس بات کا اندیشہ چونکہ اور بھی زیادہ تھا، اس وجہ سے آپ ﷺ نے اپنے سوالات کے ذریعے سے معاملے کا کوئی پہلو غیر واضح نہیں رہنے دیا۔ اس سے کوئی شخص اگر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بے چارہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ زنا کیا ہے تو اس کے بارے میں پھر کیا عرض کیا جاسکتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے لوگ اگر زنا بالجبر کے متعلق یہ بھی کہتے ہیں کہ شرفا بھی کبھی کبھی اس کے مرتکب ہو جایا کرتے ہیں تو اس پر کچھ تعجب نہ کرنا چاہیے۔ عقل ودانش کی جو مقدار اب ہمارے مدرسوں میں باقی رہ گئی ہے، اس کے بل بوتے پر اس سے زیادہ کیا چیز ہے جس کی توقع ان لوگوں سے کی جاسکتی ہے؟ بہر حال یہ ہے ان سب باتوں کی حقیقت، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی شخص اصرار کرتا ہے کہ ان روایات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ہستی معصوم تھا جو بس یونہی راہ چلتے کسی عورت سے بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھا تو اُسے پھر مان لینا چاہیے کہ اس صورت میں نہایت شدید قسم کا جو تناقض اس کے متعلق نبی ﷺ کی تقریر اور ان روایات کے مضمون میں پیدا ہو جائے گا، اس کی بنا پر کوئی حتمی بات اس مقدمے کے بارے میں بھی کسی شخص کے لیے کہنا ممکن نہ ہوگا۔‘‘ (برہان، ص:۸۳تا۸۵، طبع ہفتم ۲۰۰۹ء)

غامدی صاحب مزید لکھتے ہیں:

’’یہ ہیں وہ روایتیں اور مقدمات جن کی بنیاد پر ہمارے فقہا قرآن مجید کے حکم میں تغیر کرتے اور زنا کے مجرموں کے لیے ان کے محض شادی شدہ ہونے کی بنا پر رجم کی سزا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سارے مواد پر جو تبصرہ ہم نے کیا ہے، اس کی روشنی میں پوری دیانت داری کے ساتھ اس کا جائزہ لیجیے، اس سے زیادہ سے زیادہ اگر کوئی بات معلوم ہوتی ہے تو بس یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے زنا کے بعض مجرموں کو رجم اور جلا وطنی کی سزا بھی دی ہے، لیکن کس قسم کے مجرموں کے لیے یہ سزا ہے اور حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے خلفاء رضی اللہ عنہم نے کس طرح کے زانیوں کو یہ سزا دی؟ اس سوال کے جواب میں کوئی حتمی بات ان مقدمات کی رودادوں اور ان روایات کی بنیاد پر نہیں کہی جاسکتی۔‘‘ (برہان ص:۸۸)

حضرت ماعز رضی اللہ عنہ حمید الدین فراہی کے قلم کی زد میں

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ:

’’اس سزا (رجم) کا مأخذ درحقیقت کیا ہے؟ یہی وہ عقدہ ہے جسے امام حمید الدین فراہی نے اپنے رسالہ ’’احکام الاصول باحکام الرسول‘‘ میں حل کیا ہے۔ اپنے اصول کے مطابق انہوں نے ان مبہم اور متناقض روایات سے قرآن مجید کے حکم میں کوئی تغیر کرنے کے بجائے انہیں اس کتاب کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ ان کے نزدیک رجم اور جلاوطنی کی اس سزا کا مأخذ سورۂ مائدہ کی آیت محاربہ ہے۔

امام حمید الدین فراہی کی اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ زانی کنوارا ہو یا شادی شدہ، اس کی اصل سزا تو سورۂ نور میں قرآن کے صریح حکم کی بنا پر سو کوڑے ہی ہے، لیکن مجرم اگر زنا بالجبر کا ارتکاب کرے یا بدکاری کو پیشہ بنالے یا کھلم کھلا اَوباشی پر اتر آئے یا اپنی آوارہ منشی، بدمعاشی اور جنسی بے راہ روی کی بنا پر شریفوں کی عزت وناموس کے لیے خطرہ بن جائے یا مردہ عورتوں کی نعشیں قبروں سے نکال کر ان سے بدکاری کا مرتکب ہو یا اپنی دولت اور اقتدار کے نشے میں غربا کی بہو بیٹیوں کو سر بازار برہنہ کرے یا کم سن بچیاں بھی اس کی درندگی سے محفوظ نہ رہیں تو مائدہ کی اس آیت محاربہ کی رو سے اُسے رجم کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔ اسی طرح مجرم کے حالات اور جرم کی نوعیت کے لحاظ سے جو دوسری سزائیں اس آیت میں بیان ہوئی ہیں، وہ بھی اگر عدالت مناسب سمجھے تو اس طرح کے مجرموں کو دے سکتی ہے۔ انہی سزاؤں میں سے ایک سزا جلاوطنی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان مجرموں کو جو محض زنا ہی کے مجرم نہیں تھے، بلکہ اس کے ساتھ اپنی اوباشی کی بنا پر فساد فی الارض کے مجرم بھی تھے، یہ دونوں سزائیں دی ہیں، چنانچہ ان میں وہ مجرم جو اپنے حالات اور جرم کی نوعیت کے لحاظ سے رعایت کے مستحق تھے، انہیں آپ نے زنا کے جرم میں آیت نور کے تحت سو کوڑے مارنے کے بعد معاشرے کو ان کے شر وفساد سے بچانے کے لیے ان کی اوباشی کی پاداش میں مائدہ کی اسی آیت محاربہ کے تحت جلاوطنی کی سزا دی اور ان میں سے وہ مجرم جنہیں کوئی رعایت دینا ممکن نہ تھا، اسی آیت کے حکم ’’أن یقتلو‘‘ کے تحت رجم کردیے گئے۔‘‘ (برھان، ص:۹۱، طبع ہفتم)

حضرت ماعز رضی اللہ عنہ امین احسن اصلاحی کے قلم کی زد میں

امین احسن اصلاحی نے بھی حمید الدین فراہی کی طرح سنگساری اور رجم کی سزا کو آیت محاربہ کے تحت داخل کیا ہے اور نام لیے بغیر حضرت ماعز رضی اللہ عنہ اور رجم کے سزایافتہ دیگر مرد وخواتین کو انہیں القاب سے یاد کیا جن سے حمید الدین فراہی نے یاد کیا، چنانچہ سورۂ مائدہ کی آیتِ محاربہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ا:......’’اللہ اور رسول سے محاربہ یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ یا جتھا جرأت وجسارت، ڈھٹائی اور بے باکی کے ساتھ اس نظام حق وعدل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے جو اللہ اور رسول (ﷺ) نے قائم فرمایا ہے۔ اس طرح کی کوشش اگر بیرونی دشمنوں کی طرف سے ہو تو اس کے مقابلے کے لیے جنگ وجہاد کے احکام تفصیل کے ساتھ الگ بیان ہوئے ہیں۔ یہاں بیرونی دشمنوں کے بجائے اسلامی حکومت کی رعایا ہوتے ہوئے - عام اس سے کہ وہ مسلم ہیں یا غیر مسلم - اس کے قانون اور نظام کو چیلنج کریں۔

قانون کی خلاف ورزی کی ایک شکل تو یہ ہے کہ کسی شخص سے کوئی جرم صادر ہو جائے، اس صورت میں اس کے ساتھ شریعت کے عام ضابطۂ حدود وتعزیرات کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے، اپنے شر وفساد سے علاقے کے امن ونظم کو درہم برہم کردے، لوگ اس کے ہاتھوں اپنی جان، مال، عزت، آبرو کی طرف سے ہر وقت خطرے میں مبتلا رہیں۔ قتل، ڈکیتی، رہزنی، آتش زنی، اغوا، زنا، تخریب، ترہیب اور اس نوع کے سنگین جرائم حکومت کے لیے لاء اور آرڈر کا مسئلہ پیدا کردیں۔ ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے عام ضابطۂ حدود وتعزیرات کے بجائے اسلامی حکومت مندرجہ ذیل اقدامات کرنے کی مجاز ہے۔'' (تدبر قرآن، ج:۲،ص:۵۰۵)

۲:.....'' (قرآن میں تقتیل کا حکم مذکور ہے) اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ ان کو عبرت انگیز اور سبق آموز طریقہ پر قتل کیا جائے جس سے دوسروں کو سبق ملے۔ صرف وہ طریقۂ قتل اس سے مستثنیٰ ہوگا جو شریعت میں ممنوع ہے، مثلاً: آگ میں جلانا، اس کے ماسوا دوسرے طریقے جو غنڈوں اور بدمعاشوں کو عبرت دلانے، ان کو دہشت زدہ کرنے اور لوگوں کے اندر قانون اور نظم کا احترام پیدا کرنے کے لیے ضروری سمجھے جائیں، حکومت ان سب کو اختیار کرسکتی ہے۔ رجم یعنی سنگسار کرنا بھی ہمارے نزدیک تقتیل کے تحت داخل ہے۔'' (تدبر قرآن، ج:۲،ص:۵۰۵)

۳:.....اس وجہ سے وہ غنڈے اور بدمعاش جو شریفوں کی عزت وناموس کے لیے خطرہ بن جائیں، جو زنا اور اغوا کو پیشہ بنالیں، جو دن دہاڑے لوگوں کی عزت وآبرو پر ڈاکہ ڈالیں اور کھلم کھلا زنا بالجبر کے مرتکب ہوں، ان کے لیے رجم کی سزا اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے۔ (تدبر قرآن، ج:۲،ص:۵۰۴)

جن افراد کو عہد نبویؐ میں رجم کیا گیا، امین احسن اصلاحی کے نزدیک وہ سب غنڈے تھے، لکھتے ہیں:

۴:.....''اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بہت سے ڈیرے والیاں ہوتی تھیں جو پیشہ کراتی تھیں اور ان کی سرپرستی زیادہ تر یہودی کرتے تھے جو ان کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتے تھے، اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد ان لوگوں کا بازار سرد پڑ گیا، لیکن اس قسم کے جرائم پیشہ آسانی سے باز نہیں آتے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی قماش کے کچھ مرد اور بعض عورتیں زیر زمین یہ پیشے کرتے رہے اور تنبیہ کے باوجود باز نہیں آئے، بالآخر جب وہ قانون کی گرفت میں آئے تو مائدہ کی اسی آیت کے تحت - جس کا حوالہ اوپر گزرا - آپ ﷺ نے رجم کرایا۔'' (تدبر قرآن ج۲ص:۵۰۶)

رجم سے متعلق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے امین احسن اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

''بہرحال یہ روایت بالکل بے ہودہ ہے اور ستم یہ کہ اُسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔'' (تدبر قرآن، ص:۵۰۳)

رجم شدہ صحابہؓ وصحابیاتؓ کو مغفرت کی بشارت

عہد نبویؐ میں جن صحابہؓ اور صحابیاتؓ پر رجم کا قانون شرعی نافذ کیا گیا، ان سے متعلق عقیدت ومغفرت اور نفرت وعداوت کے دونوں پہلو سامنے آسکتے تھے، اس لیے لسانِ نبوت سے ان کی مغفرت اور جنت کی بشارت بالکل واضح طور پر آگئی، تاکہ آئندہ ان سے متعلق کسی کی زبان سے غلط اور ہتک آمیز جملہ صادر نہ ہوجائے، چنانچہ صحیح مسلم، ج:۲، ص:۶۸ پر حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ کے لیے استغفار کی دعا کرو، لوگوں نے اس طرح دعا کی: ''غَفَرَ اللّٰهُ لِمَاعِزِ بْنِ مَالِكٍ'' اللہ تعالیٰ ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ کی مغفرت فرمائے، پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ أُمَّةٍ لَوَسِعَتْهُمْ۔''......''اس (ماعز رضی اللہ عنہ) نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک امت پر تقسیم کردی جاتی تو پوری امت کو کافی ہوتی۔''

نسائی میں بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

''لَقَدْ رَأَيْتُهُ بَيْنَ أَنْهَارِ الْجَنَّةِ يَنْغَمِسُ۔'' (فتح الباری، ج:۱۲، ص:۱۳۰)

ترجمہ: ''میں نے ماعز (رضی اللہ عنہ) کو دیکھا کہ جنت کی نہروں میں غوطے لگا رہا ہے۔''

مسند احمد بروایت ابوذر رضی اللہ عنہ یہ ارشاد مروی ہے:

''قَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ وَأَدْخَلَ الْجَنَّةَ۔'' (فتح الباری، ج ۱۲، ص:۱۳۰)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے ماعز (رضی اللہ عنہ) کو بخش دیا اور اُسے جنت میں داخل کردیا۔''

صحیح ابوعوانہ میں بروایت جابر رضی اللہ عنہ یہ الفاظ ہیں:

''فَقَدْ رَأَيْتُهُ يَتَخَضْخَضُ فِيْ أَنْهَارِ الْجَنَّةِ۔'' (فتح الباری، ج:۱۲، ص:۱۳۰)

ترجمہ: ''میں نے ماعز (رضی اللہ عنہ) کو جنت کی نہروں میں غوطے لگاتے ہوئے دیکھا ہے۔''

صحیح مسلم ج:۲، ص:۶۸ پر غامدیہ کا مشہور واقعہ بھی ہے، سنگساری کے دوران حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے چہرہ پر غامدیہ کے خون کا چھینٹا آکر لگا تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ان کو برا جملہ کہا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''مَهْلًا يَا خَالِدُ! فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لَوْ تَابَهَا صَاحِبُ مَكْسٍ لَغُفِرَ لَهُ۔''

ترجمہ: ''اے خالد! برا بھلا کہنے سے باز رہو، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اس غامدیہ نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایسی توبہ ٹیکس وصول کرنے والا کرتا تو اس کی بھی بخشش ہوجاتی۔''

پھر آپ ﷺ نے اس پر نماز پڑھنے کا حکم فرمایا اور اُسے دفن کردیا گیا۔ صحیح مسلم جلد:۲، صفحہ:۶۹ پر مذکورہ غامدیہ خاتون رضی اللہ عنہا کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اس غامدیہ نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر مدینہ کے ستر گناہ گاروں پر تقسیم کردی جائے تو ان کے لیے بھی کافی ہوجائے گی، کیا تمہیں اس سے

افضل تو یہ مل سکتی ہے کہ اس نے اللہ کی رضا کے لیے اپنی جان قربان کردی۔‘‘

قارئین حضرات غور فرمائیں! لسانِ نبوت سے ان صحابہؓ وصحابیاتؓ کے لیے کس قدر عظیم بشارت سنائی جارہی ہے اور کس قدر ان کی منزلت اور عظمت بتائی جارہی ہے اور دوسری طرف دیکھئے کہ غامدی صاحب اور ان کے استاد امین احسن اصلاحی اور ان کے استاد حمید الدین فراہی کی طرف سے ان کے بارے میں کیا مغلظات سنائے جارہے ہیں، کم ازکم یہ خیال تو کرتے کہ یہ آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ ہیں یا یہ خیال کرتے کہ مرنے کے بعد کسی کو اس طرح یاد کرنے کی ممانعت ہے یا یہ سوچتے کہ ہم تو بڑے اخلاق کے دعویدار ہیں اور دوسروں سے اس کے طلب گار ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان دانشوروں کا لہجہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور احادیث کے بارے میں بالکل خوارج اور روافض کا ہے۔

خاتمۂ کلام

اس مضمون میں جو کچھ میں نے پیش کیا ہے، یہ تو غامدی صاحب کے منشور کے دفعات تھے، اس کے علاوہ غامدی صاحب کی مختلف کتابوں میں جو غلط نظریات موجود ہیں، اس کی ایک مختصر فہرست میں قارئین کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں، تاکہ بطور خلاصہ حوالہ جات کے ساتھ غامدی صاحب کے غلط نظریات مسلمانوں کے سامنے آجائیں، ان کے سارے غلط نظریات کا پیش کرنا تو بہت لمبا کام ہے، لیکن چند اہم غلطیوں کی نشاندہی بطور مشتے از نمونہ خروارے پیش خدمت ہے۔ یہ عبارات اور حوالہ جات میں نے ’’غامدی مذہب کیا ہے؟‘‘ سے نقل کیے ہیں۔ غامدی صاحب کے عقائد ونظریات کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

۱:......قرآن کی صرف ایک ہی قراءت درست ہے، باقی سب قراءتیں عجم کا فتنہ ہیں۔ (میزان، صفحہ:۲۵، ۲۶، ۳۲، طبع دوم، اپریل ۲۰۰۲ء)

۲:......سنت قرآن سے مقدم ہے۔ (میزان، صفحہ:۵۲، طبع دوم، اپریل ۲۰۰۲ء)

۳:......سنت صرف افعال کا نام ہے۔ اس کی ابتدا حضرت محمد ﷺ سے نہیں، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوتی ہے۔ (میزان، صفحہ:۱۰، ۶۵، طبع دوم، اپریل، ۲۰۰۲ء)

۴:......سنت صرف ستائیس (۲۷) اعمال کا نام ہے۔ (میزان، صفحہ:۱۰، طبع دوم، اپریل ۲۰۰۲ء)

۵:......حدیث سے کوئی اسلامی عقیدہ یا عمل ثابت نہیں ہوتا۔ (میزان، صفحہ:۶۴، طبع دوم، اپریل ۲۰۰۲ء)

۶:......دین کے مصادر وماخذ قرآن کے علاوہ دین فطرت کے حقائق، سنت ابراہیمی اور قدیم صحائف ہیں۔ (میزان، صفحہ:۴۸، طبع دوم، اپریل ۲۰۰۲ء)

۷:......دین میں معروف اور منکر کا تعین فطرت انسانی کرتا ہے۔ (میزان، صفحہ:۴۹، طبع دوم، اپریل ۲۰۰۲ء)

۸:......نبی ﷺ کی رحلت کے بعد کسی شخص کو کافر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ (ماہنامہ اشراق، دسمبر ۲۰۰۲ء، صفحہ:۵۴، ۵۵)

۹:......زکوۃ کا نصاب منصوص اور مقرر نہیں ہے۔ (قانونِ عبادات، صفحہ:۱۱۹، طبع: اپریل ۲۰۰۵ء)

۱۰:......اسلام میں موت کی سزا صرف دو جرائم (قتل نفس اور فساد فی الارض) پر دی جاسکتی ہے۔ (برہان، صفحہ:۱۴۳، طبع چہارم، جون ۲۰۰۶ء)

۱۱:......دیت کا قانون وقتی اور عارضی تھا۔ (برہان، صفحہ:۱۸، ۱۹، طبع چہارم، جون، ۲۰۰۶ء)

۱۲:......قتل خطأ میں دیت کی مقدار منصوص نہیں ہے اور یہ ہر زمانے میں تبدیل کی جاسکتی ہے۔ (برہان، صفحہ:۱۸، ۱۹، طبع چہارم، جون ۲۰۰۶ء)

۱۳:......عورت اور مرد کی دیت (Blood Money) برابر ہوگی۔ (برہان، صفحہ:۱۸، طبع چہارم، جون ۲۰۰۶ء)

۱۴:......مرتد کے لیے قتل کی سزا نہیں ہے۔ (برہان، صفحہ:۱۴۰، طبع چہارم، جون ۲۰۰۶ء)

۱۵:......شادی شدہ اور کنوارے زانی دونوں کے لیے ایک ہی حد سو کوڑے ہے۔ (میزان، صفحہ: ۲۹۹، ۳۰۰، طبع دوم، اپریل ۲۰۰۲ء)

۱۶:......شراب نوشی پر کوئی شرعی سزا نہیں ہے۔ (برہان، صفحہ:۱۳۸، طبع چہارم، جون ۲۰۰۶ء)

۱۷:......غیر مسلم بھی مسلمانوں کے وارث ہوسکتے ہیں۔ (میزان، صفحہ:۱۷۱، طبع دوم، اپریل ۲۰۰۲ء)

۱۸:......سور کی کھال اور چربی وغیرہ کی تجارت اور ان کا استعمال شریعت میں ممنوع نہیں ہے۔ (ماہنامہ اشراق، اکتوبر ۱۹۹۸ء، صفحہ:۷۹۔ میزان، صفحہ:۳۲۰، طبع دوم، اپریل ۲۰۰۲ء)

۱۹:......عورت کے لیے دوپٹہ یا اوڑھنی پہننا شرعی حکم نہیں۔ (ماہنامہ اشراق، مئی ۲۰۰۲ء، صفحہ:۴۷)

۲۰:......کھانے کی صرف چار چیزیں ہی حرام ہیں: خون، مردار، سور کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ۔ (میزان، صفحہ:۳۱۱، طبع دوم، اپریل ۲۰۰۲ء)

۲۱:......بعض انبیاء قتل ہوئے ہیں، مگر کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا۔ (میزان، حصہ اول، صفحہ:۲۱، طبع ۱۹۸۵ء)

۲۲:......حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پاچکے ہیں۔ (میزان، حصہ اول، صفحہ:۲۲، ۲۳، ۲۴، طبع ۱۹۸۵ء)

۲۳:......یاجوج ماجوج اور دجال سے مراد مغربی اقوام ہیں۔ (ماہنامہ اشراق، جنوری، ۱۹۹۶ء، صفحہ:۶۱)

۲۴:......جانداروں کی تصویریں بنانا بالکل جائز ہے۔ (ادارہ المورد کی کتاب ''تصویر کا مسئلہ'' صفحہ:۳۰)

۲۵:......موسیقی اور گانا بجانا بھی جائز ہے۔ (ماہنامہ اشراق، مارچ، ۲۰۰۴ء، صفحہ:۱۸، ۱۹)

۲۶:......عورت مردوں کی امامت کراسکتی ہے۔ (ماہنامہ اشراق، مئی ۲۰۰۵ء، صفحہ:۳۵ تا ۴۶)

۲۷:......اسلام میں جہاد وقتال کا کوئی شرعی حکم نہیں۔ (میزان، صفحہ:۲۶۴، طبع دوم، اپریل ۲۰۰۲ء)

۲۸:......کفار کے خلاف جہاد کرنے کا حکم اب باقی نہیں رہا اور مفتوح کافروں سے جزیہ لینا جائز نہیں۔ (میزان، صفحہ:۲۷۰، طبع دوم، اپریل ۲۰۰۲ء)

اہل علم جانتے ہیں کہ مذکورہ بالا تمام عقائد ونظریات قرآن وسنت اور اجماعِ امت کے خلاف ہیں اور ان سے دین اسلام کے مسلمات کی نفی ہوتی ہے جو موجب کفر ہے۔

(ماخوذ از ''غامدی مذہب کیا ہے؟'' تالیف پروفیسر مولانا محمد رفیق صاحب، از صفحہ:۱۲ تا ۱۵)

www.banuri.edu.pk

نظم وضبط کی اہمیت اسلامی تعلیمات کی روشنی میں !

مولانا امداداللہ یوسف زئی

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الأنبیاء والمرسلین، أمابعد:

’’إن الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتاً۔‘‘ (القرآن)

ترجمہ: ’’یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے۔‘‘ (بیان القرآن)

’’إِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یُحِبُّ إِذَا عَمِلَ أَحَدُکُمْ عَمَلاً أَن یُّتْقِنَہٗ۔‘‘ (الحدیث)

تمہید

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم سب کا یہ ایمان ہے کہ دین اسلام کامل ومکمل دین ہے، جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ دین اسلام جہاں زندگی کے ہر پہلو پر اصولی تعلیمات فراہم کرتا ہے، وہاں دینی امور کی جزئیات بھی تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ یہ محض ایک دعویٰ نہیں، بلکہ قرآن وحدیث کی نصوص، فقہائے اسلام کی توضیحات وتشریحات اور علمائے امت کی کاوشیں اس کا بیّن ثبوت ہیں۔

چونکہ اسلام قیامت تک رہتی انسانیت کے لیے بھیجا گیا اور یہ اللہ کا آخری پیغام ہے، اس لیے اس میں نظم وضبط، اتحاد واتفاق اور اجتماعیت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔

نظام کا مفہوم

نظام نظم سے ہے، اور نظم لڑی میں پرونے کو کہتے ہیں۔ گویا اسلام افرادِ امت کے لیے ایک ’’مالا‘‘ ہے، اور اس ’’مالا‘‘ میں افرادِ امت میں سے ہر فرد کو یکجا سمیٹ کر رکھنا امر مرغوب ہے، اور ان افراد کے بکھر جانے سے جیسے ’’مالا‘‘ کے سارے موتی بکھر جاتے ہیں، ویسے ہی امت بکھر جاتی ہے، جو کسی بھی طرح محبوب نہیں، اس کو حدیث میں یوں سمجھایا گیا ہے کہ:

’’**المُسلمون کجسدٍ واحدٍ**۔‘‘ (صحیح البخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الناس والبھائم، ج:۲، ص:۸۸۹، ط: قدیمی)

یعنی سارے مسلمان ایک جسد کی مانند ہیں، اگر ایک عضو میں تکلیف ہو تو سارا ہی بدن تکلیف محسوس کرتا ہے، ایسے ہی اگر مسلمانوں کے ایک گروہ یا ایک جماعت کو تکلیف پہنچے تو دنیا کے سارے مسلمان اس جماعت کی خاطر کھڑے ہو جائیں۔ دین اسلام ایک رسی ہے جو امت مسلمہ کے افراد کو جوڑ

کر باہمی مربوط کر کے حق تعالیٰ شانہٗ تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ اللہ پاک نے قرآن مجید میں باہمی ربط کو مضبوطی سے قائم رکھنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

’’وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً۔‘‘ (آل عمران:۱۰۳)

یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو، اس اعتصام واعتصاد پر بہت زور دیا گیا ہے اور امت مسلمہ کی کامیابی وسرفرازی کا ایک بہت بڑا ذریعہ یہی اعتصام ہے۔ کتب احادیث میں ’’کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة‘‘ کے ضمن میں بے شمار احادیث سے متابعت جماعت کا حکم اور مفارقت جماعت سے اجتناب کو بیان کیا گیا ہے۔ اللہ پاک نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

’’وَأَطِيْعُوْا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ۔‘‘ (الانفال:۴۶)

ترجمہ: اور اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت (کالحاظ) کیا کرو، اور نزاع مت کرو (نہ اپنے امام سے نہ آپس میں) ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی، اور صبر کرو، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (بیان القرآن)

یعنی آپس میں نزاع اور کشاکش نہ کرو، ورنہ تم میں بزدلی پھیل جائے گی، اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ اس آیت کریمہ میں باہمی نزاع کے دو نتیجے بیان کئے گئے ہیں: ایک یہ کہ تم ذاتی طور پر کمزور اور بزدل ہو جاؤ گے۔ باہمی کشاکش اور نزاع سے دوسروں کی نظر میں حقیر ہو جانا تو بدیہی امر ہے، لیکن اپنی قوت پر کیا اثر پڑتا ہے کہ اس میں کمزوری اور بزدلی آجائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باہمی اتحاد واعتماد کی صورت میں ہر ایک انسان کے ساتھ پوری جماعت کی طاقت لگی ہوئی ہے، اس لیے ایک آدمی اپنے اندر پوری جماعت کی قوت محسوس کرتا ہے اور جب باہمی اتحاد واعتماد نہ رہا تو ہر آدمی کی قوت اکیلی قوت رہ گئی۔

باہمی اتحاد کے قیام اور افتراق وانتشار سے بچاؤ کی راہ نظم کا قیام ہے۔ نظم فرد واحد کی مانند انسانیت کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے، اور بہترین معاشرہ وہی کہلاتا ہے جس میں خدائی تعلیمات کی تعمیل ہو اور زندگی کے ہر شعبے میں آسمانی ہدایات پیش نظر رکھی جائیں۔ غلط فہمی سے ہمارے معاشرے میں نظم وضبط کو محض ملکی وقومی امور کا لازمہ سمجھا جاتا ہے، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

’’إن اللّٰه تعالٰى يحب إذا عمل أحدكم عملاً أن يتقنه۔‘‘

(شعب الایمان، باب فی الامانات وما یجب من أدائها الی أهلها، ج:۷، ص:۲۳۲، ط:مکتبۃ الرشد ریاض)

’’اللہ تعالیٰ تمہارے کسی بھی کام میں یہ پسند کرتا ہے کہ اُسے عمدگی اور سلیقہ سے کیا جائے۔‘‘

ہر چھوٹا یا بڑا عمل سلیقہ مندی کا تقاضا کرتا ہے، اور دین نے ہمیں یہ سلیقہ سکھایا ہے۔ سلیقہ مندی نظم کے قیام کا باعث ہے، اور بظاہر معمولی سمجھی جانے والی بدسلیقی، بدنظمی کا ذریعہ وسبب بنتی ہے۔ مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ معارف القرآن میں سورۂ صافات کی آیت ’’وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا‘‘ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر کام میں نظم وضبط اور ترتیب وسلیقہ کا لحاظ رکھنا دین میں مطلوب اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہو یا اس کے احکام کی تعمیل، یہ دونوں مقصد اس طرح بھی حاصل ہو سکتے تھے کہ فرشتے صف باندھنے کے بجائے ایک غیر منظّم بھیڑ کی شکل میں جمع ہو جایا کریں، لیکن اس بدنظمی کے بجائے انہیں صف بندی کی توفیق دی گئی، اور اس آیت میں ان کے اچھے اوصاف میں سب سے پہلے اسی وصف کو ذکر کر کے بتادیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند ہے۔ (معارف القرآن، ج:۷، ص:۴۱۷، ط: مکتبہ معارف القرآن)

اسی نظم وضبط کے پہلو سے مختلف شعبہائے زندگی سے متعلق دینی تعلیمات کا ایک اجمالی جائزہ لیتے ہیں:

عبادات

عبادات میں بنیادی امور ارکانِ خمسہ ہیں، ان تمام ارکان میں نظم جلوہ گر ہے۔

۱:.....نظامِ صلوۃ

باجماعت نماز بھی نظم وضبط اور اجتماعیت کا پنج وقتہ درس ہے کہ دن میں پانچ مرتبہ مسلمان مسجد میں جب اکٹھے ہوں تو یہ احساس رہے کہ سارے مسلمان یک جان ہیں، الگ الگ نہیں ہیں اور اس جماعت کی اتنی اہمیت بتائی گئی ہے کہ جنگ کے دوران بھی اس کو ترک کرنے سے گریز کیا گیا اور ''صلاۃ الخوف'' مشروع کی گئی اور مسلمانوں کو یکسانیت کا احساس دلانے کے لیے ''سووا صفوفکم، فإن تسویة الصفوف من إقامة الصلوة۔'' (صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب اقامۃ الصّف من تمام الصلوۃ) ''اپنی صفیں درست رکھو، کیونکہ صفیں درست رکھنا نماز کی تکمیل کا حصہ ہے۔'' کا حکم بھی دیا گیا۔ نیز نماز کے ارکان وشرائط نظم کی کھلی دلیل ہیں۔ حدیث شریف میں حکم دیا گیا ہے کہ جب آدمی مسجد میں جائے تو جماعت میں شامل ہونے کے لیے بھاگ دوڑ نہ کرے، بلکہ وقار اور سنجیدگی کو ملحوظ رکھے۔ جماعت کی نماز میں مقتدی امام کی پیروی کرے وغیرہ، یہ تمام امور نظم وضبط کے دائرے میں آتے ہیں۔ پھر جمعہ وعیدین میں بڑے اجتماع سے اسی اجتماعیت اور عدم مفارقت کا درس دینا مقصود ہے کہ مسلمان ایک جسم ہیں، اگرچہ دنیاوی مشاغل میں کچھ جدا ہو جائیں، لیکن حقیقت میں یک جان ہیں۔

۲:.....نظامِ صوم

سال میں ماہِ رمضان میں روزے رکھنے کی مشروعیت کی ایک حکمت یہی ہے کہ مالدار آدمی جب پورے دن بھوکا رہے تو اس کو احساس ہو کہ غریب ولاچار لوگ کیسے ساری زندگی ایسے ہی فقر وفاقہ میں گزار دیتے ہیں، شریعت کے مزاج میں یہ بات ہے کہ غریبوں کا احساس کیا جائے، لاچار ومسکین کا خیال رکھا جائے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب احساس پیدا ہو، اسی احساس کو پیدا کرنے کے لیے

شریعت نے روزے کو مشروع قرار دیا، پھر روزے میں اوقات کی تعیین اور دیگر متعلقہ احکام بھی نظم کی افزائش کا باعث ہیں، گویا ''صوم'' بھی اجتماعی نظم کا سبق ہے۔

۳:.....نظامِ زکوۃ

اسی طرح زکوٰۃ کی مشروعیت اس بات کا درس دینے کے لیے ہے کہ مسلمان وہ نہیں جو صرف اپنی دنیا بنانے اور سمیٹنے کی فکر میں لگا رہے اور قریب کے دوسرے غریب لوگ فقر وفاقہ میں پڑے رہیں، اسی بات کا سبق سکھاتے ہوئے حضور ﷺ نے اِرشاد فرمایا: ''**تؤخذ من أغنیائهم وتُرَدُّ علٰی فُقرائهم**'' گویا زکوۃ ادا کرتے ہوئے بھی مسلمان اجتماعیت کے قیام کی لڑی پرورہا ہوتا ہے۔

۴:.....نظامِ حج

جس طرح پنج وقتہ نماز مسلمانوں کو متابعتِ جماعت کی یاددہانی کے لیے ہے اور عیدین کا اجتماع بھی اسی یاددہانی کی کڑی ہے تو بالکل اسی طرح صاحبِ استطاعت پر زندگی میں ایک مرتبہ حج فرض کردیئے جانے کی ایک حکمت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ساری دنیا سے مسلمان ایک جگہ جمع ہوجائیں اور اس اجتماع سے مسلمانوں کی یکجہتی کا اظہار ہو۔ حج کی فرضیت میں بھی مخالفت سے اجتناب اور مقارنت جماعت کا پہلو پایا جاتا ہے۔

۵: نظام جہاد

اسلامی نظام کی ایک اہم اَساس یہ بھی ہے کہ قوموں کے درمیان طاقت کا توازن قائم رہے، ایسا نہ ہو کہ طاقت ور کمزور کو لقمۂ تر بنالے، بلکہ ہر قوم کو اپنے تحفظ، دفاع اور طاقت کے ناجائز تسلط سے محفوظ رہنے کے لیے طاقت کو یکجا رکھنے اور اس کو نظم ونسق سے استعمال کرنے کے اصول بھی تفصیل سے بتائے ہیں، انہی تفصیلات کا اجمالی عنوان ''جہاد'' ہے۔ جہاد کے لیے تیاری، صف بندی، عزم وحوصلہ، ثابت قدمی، ضعیفوں، کمزوروں، عورتوں اور مذہبی طبقے سے عدمِ تعرض کے تفصیلی احکام سکھائے ہیں۔ یہ تفصیلات اسلام میں جنگی نظام کے نظم ونسق اور ہمہ جہتی کا مظہر ہیں۔

۶:.....واقعۂ معراج

عبادات کے ضمن میں واقعۂ معراج بھی سبق آموز ہے، اسلام ہمیں منظّم انداز میں تمام امور کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا درس دیتا ہے، اور نظم کی پابندی کے بغیر کیف ما اتفق امور کو سرانجام دینے کو ناپسند کرتا ہے، اس کی مثال ہمیں واقعۂ معراج میں ملتی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ براق پر سوار ہوکر آسمانوں کی طرف گئے، تو امت کو نظام کی اہمیت سکھلانے اور جتلانے کے لیے کچھ ایسے واقعات سے مطلع فرمایا کہ جس کا خلاف متوقع تھا۔ جب حضور ﷺ آسمانِ دنیا پر پہنچے تو سوال ہوا

کہ: ’’من ھذا؟ ‘‘ پھر دوسرا سوال ہوا: ’’ومن معک ؟‘‘ پھر تیسرا سوال ہوا: ’’وقد أرسل الیہ؟ ‘‘ پھر اس کے بعد ’’مرحباً بہٖ فنعم المجیء جاء ‘‘ سے استقبال ہوا، اور آگے حضرت آدم علیہ السلام نے ’’مرحباً بالابن الصالح والنبی الصالح ‘‘ کہہ کر آمد پر خوشی کا اظہار فرمایا، پھر ان سوالات کا سلسلہ ساتویں آسمان تک جاری رہا۔ مزید برآں یہ بھی اسی واقعہ میں نظم کا حصہ نظر آتا ہے کہ جبریل امین علیہ السلام کو ایک موقع پر مقام خاص کے بعد آگے جانے کی اجازت نہیں دی گئی، اور حضور ﷺ کی خصوصیت کہ آپ مزید آگے تشریف لے گئے، جس کو اللہ پاک نے قرآن مجید میں بھی بیان فرمایا: ’’ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰی ۔‘‘ (النجم:۸،۹)

اس واقعہ سے نظام کی اہمیت اور نظم کی بلا استثناء پاسداری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ باوجود اللہ پاک کے علام الغیوب ہونے کے ہر آسمان پر سوالات کا سلسلہ بتاتا ہے کہ نظام کی پاسداری ضروری ہے، اور یہ کہ ہر کام ایک نظم کے تحت ہی ہونا چاہیے، جس سے کام باآسانی اور سہولت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔

نظامِ معاشرت وحقوق العباد

اسی طرح اسلام حقوق العباد کے معاملہ میں بھی ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جو ہر انسان کو اس کا حق دلاتا ہے، کسی کے ساتھ ظلم و ناانصافی کو قطعاً برداشت نہیں کرتا، اور اس نظام کی مثال دنیا کے کسی دوسرے مذہب اور قانون میں نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر خواتین کے معاملہ میں اسلامی نظام میں ہر بالغ مرد وعورت کو یکساں شہری اور دیوانی حقوق حاصل ہیں، وہ اپنی ذاتی اور شخصی جائیداد اور ملکیت کے حصول اور نظم ونسق اور تصرف میں بالکل آزاد ہیں۔ اس کے برعکس ’’قانونِ روما‘‘ میں خواتین مستقل طور پر مردوں کی نگرانی اور سرپرستی میں تھیں، وہ اپنے نگراں یا سرپرست کی اجازت کے بغیر نہ کوئی جائیداد حاصل کرسکتی تھیں اور نہ حاصل شدہ جائیداد میں کسی تصرف کی مجاز تھیں۔ یہ پابندی خواتین پر زندگی کے آغاز سے لے کر انتہاء تک رہتی تھی۔ یہ بات بھی دنیا کے سامنے واضح رہنی چاہیے کہ ہمارے اسلام کا یہ نظام وحی الٰہی کا مرہونِ منت ہے۔ اس کی اصل قرآن وسنت ہے۔ اس کی کوئی ہدایت یا راہنمائی کبھی کسی دوسرے مذہب سے لینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ نہ صرف فقہ اسلامی کے تشکیلی دور یعنی ابتدائی چار ہجری صدیوں میں بلکہ بعد میں کم وبیش مزید آٹھ سال تک مسلمانوں نے قانون کی کسی کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں نہیں کیا، جس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا قانون انتہائی مرتب اور منظّم ہے۔

نظامِ معاملات

جس طرح عبادات کے مختلف شعبوں میں اسلام اپنے پیروکاروں کی پوری طرح رہنمائی کرتا ہے، اسی طرح معاملات میں بھی اسلام نے باہم معاملات کرنے والے بائع ومشتری کو کچھ

اصول سکھلا دیئے جس سے وہ ایک نظم کے تحت اپنے کاروباری مسائل کو حل کرسکیں۔ اور اس نظام کا داعیہ یہاں بھی وہی ہے کہ کہیں متعاقدین کے درمیان نزاع وجدال کی صورت پیش نہ آئے، اور ہر عاقد کو اپنا پورا حق مل سکے، اور ہر قسم کے دھوکے سے گریز کرنے کی تاکید فرمادی گئی، تاکہ مسلمانوں کی اجتماعیت میں خلل واقع نہ ہو، اس نظام سے متعلق چند احادیث درج ذیل ہیں:

۱:.....نھیٰ رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن بیع الغرر۔''

(صحیح مسلم، باب بطلان بیع الحصاۃ والبیع الذی فیہ غرر)

ترجمہ:''رسول اللہ ﷺ نے بیع غرر سے منع فرمایا ہے۔ بیع غرر اس بیع کو کہتے ہیں جس میں مبیع (فروخت کی جانے والی چیز) مجہول ہو یا بیچنے والے کے قبضے سے باہر ہو۔''

۲:.....''لایسم المسلم علیٰ سوم أخیہ۔'' (صحیح مسلم، باب تحریم بیع الرجل علی بیع أخیہ وسومہ علی سومہ)

ترجمہ:''کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کے سودے پر سودا نہ کرے، یعنی کسی سے خرید و فروخت کا معاملہ ہورہا ہو تو اس میں مداخلت نہ کرے اور اس چیز کے زیادہ دام نہ لگائے۔''

۳:.....نھیٰ عن بیع الثمار حتّٰی یبدوَ صلاحُھا۔''

(مؤطا الامام مالک، باب النہی عن بیع الثمار حتی یبدو صلاحہا، ط: دار احیاء التراث العربی)

ترجمہ:''رسول کریم ﷺ نے پھلوں کو اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ ان کی پختگی ظاہر نہ ہوجائے۔''

۴:''من احتکر فھو خاطیٔ۔'' (صحیح مسلم، باب تحریم الاحتکار فی الأقوات)

ترجمہ:''نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو آدمی ذخیرہ اندوزی کرے وہ گناہ گار ہے، یعنی جو تاجر غلہ وغیرہ ضروریاتِ زندگی کا ذخیرہ عوام کی ضرورت کے باوجود مہنگائی کے لیے محفوظ رکھے۔''

۵:''اسی طرح ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے خرید وفروخت میں لوگ دھوکہ دیتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: جب تم خریدو تو کہہ دیا کرو کہ ''لاَ خِلابۃ'' یعنی اس بیع میں مجھے کوئی دھوکہ نہ ہو، اور تین دن کا اختیار مقرر کرنے کا فرمایا۔

(صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب ما یکرہ من الخداع فی البیع)

نظامِ وراثت

اسلام سراپا نظام ہے، ہر پہلو کا ایک نظام منظّم کردیا گیا ہے۔ وراثت کے باب میں بھی جب ہم اسلامی نظام پر نظر دوڑاتے ہیں تو شریعت کے احکام بالکل منفرد انداز کے نظر آتے ہیں، اور ہر فریق کا حصہ قرآن پاک میں تفصیل سے واضح کردیا گیا اور ''الأقرب فالأقرب'' اور ''القربیٰ تحجب البعدیٰ'' کے قواعد کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر قریبی رشتہ دار کو محرومی سے بچالینے کا درس بھی یہی نظام دیتا ہے۔

نظامِ سیاست

سیاست بھی زندگی کا بہت وسیع اور بہت اہم شعبہ ہے۔ اس کو بھی اسلام نے ایک نظام میں منضبط کردیا۔ اسلام میں اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور وہی اصل قانون ساز ہے، اس لیے اسلامی حکومت کے دستور کا مآخذ قرآن مجید ہے، ان کی تشریح وتفصیل اور جزئیات کی تفریع شارع علیہ السلام پر چھوڑ دی گئی ہے، چنانچہ انہی بنیادوں پر آنحضرت ﷺ نے حکومت الٰہیہ کی تشکیل فرمائی اور اس کی روشنی میں جزوی قوانین بنائے، پھر جب اسلامی حکومت کا دائرہ وسیع ہوا، نئے نئے ملک زیرنگیں ہوئے، نئی نئی قومیں مفتوح ہوئیں اور نئے نئے مسائل پیدا ہوئے، تو پھر خلفائے راشدینؓ نے کلام مجید اور رسول اللہ ﷺ کے اقوال واعمال اور فیصلوں کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے خلافت اسلامیہ کا نہایت وسیع اور مکمل نظام قائم کیا، اموی اور عباسی دور میں ''کتاب الخراج، کتاب الأموال، أحکام السلطانیة، الطرق الحکمیة'' بھی اسی نظام کو ضبط کرنے کے لیے لکھی گئیں۔

سیاست وحکومت سے متعلق جتنی جامعیت کے ساتھ اسلام نے راہنمائی فراہم کی ہے، اس کا نمونہ دیگر اقوام ومذاہب کے ہاں ناپید ہے، علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمہ ابن خلدون اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کا اجمالی تعارف اور بنیادی احوال ذکر کیے ہیں۔ مذکورہ تفصیل سے واضح ہوا کہ نظم وضبط اور اجتماعیت دین میں نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ وفاق المدارس العربیہ کے قیام کا پس منظر بھی اسی مقصد کا حصول ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام اپنے تمام شعبوں میں مرتب نظام کا نفاذ چاہتا ہے اور اس نظام سے روگردانی اور اعراض کو قطعاً ناپسند کرتا ہے جس کی دلیل ''من شذّ شُذّ فی النار''، ''علیکم بالجماعة وإیاک والفرقة''، ''ید اللّٰہ علی الجماعة'' میں ملتی ہے، اور اللہ پاک کی طرف سے نصرت کے وعدے بھی ایک جماعت ونظام کے تحت چلنے میں ہیں اور مفارقت میں وعیدیں بھی بیان کر دی گئی ہیں۔

مولانا، ملا اور مولوی کی اصطلاحات!

مفتی رفیق احمد بالاکوٹی

سوال

مولانا، ملا اور مولوی ان سب الفاظ کی اصطلاحات کیا ہیں؟ ان کا صحیح مطلب کیا ہے؟ آج کل عام ہوگیا ہے کہ کسی بھی داڑھی والے کو مولانا صاحب، ملا سے مخاطب کرتے ہیں اور کوئی اگر دینی مسئلہ بتانے لگتا ہے یا کسی غلط بات کو ٹوکتا ہے تو اس کو کہتے ہیں کہ تم ملاؤں والی بات مت کرو اور تم پورے ملا ہوگئے ہو۔ یہ بھی بتائیں کہ یہ الفاظ ہم کن اشخاص کے لیے استعمال کر سکتے ہیں؟ یہ بھی بہت عام ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان کو ان مولویوں نے تباہ کر دیا ہے۔ اس تباہی اور دہشت گردی کے پیچھے ملا ہیں اور یہ انگریز کے ایجنٹ ہیں، تو ان باتوں کی کیا حقیقت ہے؟ اور یہ کن لوگوں کی طرف اشارہ ہے؟ تو ان کی بھی تردید کر دیں اور اگر ہو سکے تو تفصیل سے بتا دیں یا کتاب کا حوالہ دے دیں۔ پاکستان کے بننے میں علمائے کرام (جن کو ناواقف لوگ ملا کہتے ہیں) کا کیا کردار رہا؟

جواب

’’مولانا‘‘، ’’ملاّ‘‘ اور ’’مولوی‘‘ یہ الفاظ بالعموم اسلامی پیشواؤں کے لیے احترام وتعظیم کی غرض سے بولے جاتے تھے اور اب بھی شرفا کے ہاں تعظیم کے لیے ہی مستعمل ہیں۔ کسی عالم دین کے لیے ہمارے ہاں احتراماً ’’مولانا‘‘ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، افغانستان اور آزاد ریاستوں نیز ترکی تک ’’دینی عالم‘‘ کو از راہِ احترام یا علمی فراوانی کی وجہ سے ’’ملا‘‘ یا ’’منلا‘‘ کہا جاتا تھا، ہمارے ہاں لفظ ’’علامہ‘‘ اسی کے مترادف استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح خداترس ماہر علم کے لیے فارسی بولنے والے خطوں میں ’’مولوی‘‘ کا لفظ استعمال کیا جاتا رہا ہے اور وہیں سے ہمارے ہاں بھی وارد ہوکر عام استعمال میں آچکا ہے، جیسے ’’مولوی معنوی‘‘، ’’مولوی عبدالحق‘‘ وغیرہ۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

’’مولوی اسی کو کہتے ہیں جو مولیٰ والا ہو، یعنی علم دین بھی رکھتا ہو اور متقی بھی ہو، خوفِ خدا وغیرہ اخلاقِ حمیدہ رکھتا ہو۔‘‘ (التبلیغ ص:۱۳۳، جلد اول بحوالہ تحفۃ العلماء از مولانا محمد زید، جلد اول، ص:۵۲، البرکۃ کراچی)

نیز لکھتے ہیں: ’’مولوی میں نسبت ہے مولی کی طرف، یعنی مولیٰ والا‘‘۔ (ایضاً)

الغرض یہ الفاظ اصطلاحی اعتبار سے ازراہِ احترام دین کے ماہر ومستند علما کے لیے ایجاد و استعمال ہوتے تھے۔ فی زمانہ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہونے والا دین بیزار طبقہ، جو دین کو براہِ راست مطعون کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا، وہ علمائے دین سے تقدس واحترام کی چادر کھینچ کر اپنی مذہب بیزاری کی تسکین چاہتا ہے، اور یہ کوئی نئی بات نہیں، بلکہ ایسے علما جو اپنے کردار وعمل کی بنا پر باطل کی آنکھوں کا کانٹا بنتے چلے آرہے ہوں، ہمیشہ سے باطل پرستوں کے نشانہ پر رہے ہیں، اور ان کے خلاف مختلف قسم کے پروپیگنڈے، الزامات اور بے توقیری کے القابات عام کیے جاتے ہیں، تاکہ عوام متنفر ہوکر ان سے دور ہوجائیں، اور علما سے دوری، دین سے دوری کا باعث ثابت ہوتا ہے، اس طرح دین بیزار طبقہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیابی ڈھونڈتا چلا آرہا ہے۔ علما بیزاری کے ضمن میں دین بیزاری کا یہ تخم چونکہ برطانوی سامراج کا بویا ہوا ہے، اس لیے انگریز سامراج کے کمیشن پر پلنے والی اس کی روحانی ذریت‘ انگریز مخالف علما کو دہشت گرد قرار دے کر بدنام کرنا چاہتی ہے اور انہیں انگریز کا ایجنٹ بھی قرار دیتی ہے۔

فی الواقع انگریز کے ایجنٹ اور نمک خوار کون لوگ ہیں؟ ماضی وحال میں سے اس کی فہرست مرتب کرنا میرے خیال میں یونی ورسٹی کی سطح پر بحث وتحقیق کے مراحل سے گزرنے والے کئی طلبہ کے لیے P.H.D کا مواد بن سکتا ہے۔

اپنے ناقص خیال ومطالعہ کی روشنی میں انگریز کے ایجنٹوں کی چند تاریخی وواقعاتی نشانیاں ذکر کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، ان کی روشنی میں آپ خود مثالیں ڈھونڈ کر تطبیق دیتے رہیں اور نتائج پر سر دُھنتے رہیں:

۱......انگریز کا ایجنٹ ہونے کے لیے انگریزی فکر وفلسفہ کو ایمان کا درجہ قرار دینا۔

۲......دنیا وآخرت کی کامیابی کو انگریزی تعلیم وتربیت سے جوڑنا۔

۳......رہن سہن، بودوباش اور بول چال میں انگریز کو اپنا آئیڈیل سمجھنا۔

۴......انگریز کی وفاداری، خدمت گزاری اور باج گزاری کو سرِ کامرانی اور رازِ جاویدانی سمجھنا۔

۵......اپنے سیاسی ومذہبی مسائل کے حل کے لیے انگریز کو قاضیٔ انصاف اور خلیفہ عادل جانتے ہوئے اس سے رجوع کرنا۔

۶......انگریز کی حکمرانی اور بالادستی کو ارضِ ہند پر ظلِ خداوندی سمجھنا اور باور کرانا۔

۷......انگریزی اقتدار کے دوام واستحکام کے لیے بیساکھی بننا اور اپنوں پر مظالم کے ناجائز

بہانے بنانا اور انگریز کے جاسوس کا کردار ادا کرنا۔

۸......اپنوں کو انگریز کے ہاتھوں جور وستم کا نشانہ بنا کر، انگریزی عطیہ اور خدمت کا صلہ بنا کر اپنوں کی زمینیں اپنے نام کروانا۔

۹......انگریز کے خلاف تحریکات کا حصہ بن کر انگریزوں کے لیے اپنوں کی مخبریاں کرنا۔

۱۰......انگریز سے مالی مفاد سمیٹنے کے لیے دینی حمیت اور قومی غیرت کے سوداگر بننا۔

۱۱......انگریز کے ہم نوا بن کر مسلمانوں کے خلاف اس کی سپاہ کا حصہ بننا۔

۱۲......انگریز مخالف کہلوانے کے باوجود ہمیشہ انگریزی عتاب سے محفوظ رہنا اور القابات، اعزازات اور تمغے وصول کرنا۔

اگر صرف ان چند علامتوں کی روشنی میں ماضی کا مطالعہ یا حال کا جائزہ لیا جائے تو سائل کو بآسانی اندازہ ہوسکتا ہے کہ انگریز کا ایجنٹ بننے کی اہلیت وصلاحیت کسی ’’مولانا‘‘، ’’مولوی‘‘ اور ’’ملا‘‘ میں زیادہ موزوں انداز میں پائی جاتی ہے یا کسی ’’ملا بیزار‘‘ میں؟ اللہ ہم سب کو فہم خیر اور صدقِ قول وفعل نصیب فرمائے، آمین۔

☆☆☆

حضرت مولانا محمد انور بدخشانی زید مجدہٗ کے اہم علمی ملفوظات

(حدیث اور فقہ کے درس کے دوران)

ضبط وترتیب: مولانا سفیان بلند

☆:......نیت لغوی یہ ہے کہ بندہ مطلق طاعت کی نیت کرے اور نیت شرعی یہ ہے کہ بندہ اس عمل کو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کرنے کی نیت کرے، قرآن کریم میں ''مخلصین لہ الدین'' اور حدیث مبارک میں ''إنما الأعمال بالنیات'' میں اسی نیتِ شرعیہ کی طرف اشارہ ہے کہ اعمال شرعی اس وقت قبول ہوتے ہیں جب وہ نیت شرعیہ کے ساتھ ہوں، اس فرق کو لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔

☆:......اللہ تعالیٰ کی بعض صفات ذاتی ذات الاضافات ہیں، مثلاً خالق وقادر یعنی خالق بالمخلوقات وقادر بالمقدورات، بعض صفات حقیقی ہیں، مثلاً حی، قیوم، صمد، بعض اضافی ہیں، مثلاً: ''غافر الذنب وقابل التوب، شدید العقاب''، بعض صفات سلبی ہیں، مثلاً ''لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ'' وغیرہ۔

☆:......قرآن کریم میں لفظ قرآن جہاں معرفہ آیا ہے وہاں کتاب معین یعنی قرآن کریم مراد ہے اور جہاں نکرہ آیا ہے وہاں مقرو (مصدر بمعنی مفعول) مراد ہے اور اس سے دیگر کتب سماوی بھی مراد ہیں، مثلاً ''شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْآنُ'' اور ''وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُیِّرَتْ بِہِ الْجِبَالُ''

☆:......غریب القرآن وغریب الحدیث کا تعلق مفردات سے ہے اور مشکل القرآن ومشکل الحدیث کا تعلق جملوں سے ہے، لفظ ''تناوش'' غریب القرآن ہے کہ اس کا تعلق مفردات سے ہے، مفرداتِ امام راغب غریب القرآن کے متعلق ہے، دونوں موضوعات کے لیے الگ الگ کتابیں ہیں۔

☆:......قرآن کریم کے الفاظ کو لفظ کہنے میں بے ادبی معلوم ہوتی ہے، اس لیے اصولیین نے نظم کا لفظ نکالا کہ اس کا معنی ہے موتیوں کو پرونا، جبکہ لفظ کا معنی ہے پھینکنا، چونکہ آیاتِ قرآنی موتیوں کی طرح پروئی ہوئی ہوتی ہیں، اس لیے اس کے لیے لفظ نظم مناسب ہے، مگر میری نگاہ سے نہیں گزرا کہ قرآن نے نظم قرآنی کو نظم کہا ہو۔

فرمایا کہ: اشکال ہوسکتا ہے کہ آپ نے ''نظم قرآنی'' کا لفظ نکالا، تاکہ بے ادبی نہ ہو، مگر

نظم کا لفظ بھی شعر کے معنی میں ہے جو کہ ممدوح نہیں ’’وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ، وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ‘‘ لہٰذا نظم کا لفظ بھی درست نہ ہونا چاہیے؟

جواب یہ ہے کہ نظم کا معنی مجازاً شعر ہے اور حقیقت میں موتیوں کو پرونے کے معنی میں آتا ہے اور یہاں حقیقی معنی میں مراد لیا گیا ہے۔

☆:...... ہماری بہت سی تفسیر‘ تاویل ہیں، ہم اس کو مجازاً تفسیر کہہ دیتے ہیں، حالانکہ تفسیر وہ ہے جو دلیل قطعی سے ثابت ہو اور تاویل وہ ہے جو دلیل ظنی سے ثابت ہو، یہی وجہ ہے کہ دلیل قطعی سے ثابت ہونے والا مفسَر اور دلیل ظنی سے ثابت ہونے والا مؤَوَّل کہلاتا ہے۔

☆:...... ششماہی امتحان کے بعد کتابوں کو جلدی جلدی ختم کرانا اور نہ سمجھنا، یہ کتاب کو پورا کرنے کے لیے ایک رسمی طریقہ بن گیا ہے، یہ نظام تعلیم کے ساتھ ظلم ہے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کیا پڑھ رہے ہیں، یہ دوسروں کو دھوکہ دینا درحقیقت اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے جس کا خود شعور نہیں: ’’وَمَا يَخْدَعُوْنَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ‘‘

☆:...... ہمارے درس نظامی کی معروف فقہ کی کتاب ہدایہ اُصول فقہ سے پُر ہے، اس میں اصول فقہ دونوں معنوں میں ہے، ایک معنی ہے ’’أدلة الفقه‘‘ اس کو صاحب ہدایہ ’’لقولہٖ تعالی‘‘ اور ’’لقولہٖ علیہ السلام‘‘ سے بیان کرتے ہیں اور دوسرا معنی ہے وہ قواعد کلیہ جن کی روشنی میں احکاماتِ فرعیہ کو قرآن و حدیث سے مستنبط کیا جاتا ہے، اس کو صاحب ہدایہ ’’لِأَنَّ‘‘ کہہ کر بیان کرتے ہیں، یہ فرضی اصول نہیں ہیں، بلکہ قرآن وحدیث سے استنباط کیے ہوئے ہیں۔

☆:...... احکام کی علل ’’ہدایہ‘‘ اور ’’حجۃ اللہ البالغۃ‘‘ دونوں میں ہیں، لیکن دونوں میں فرق ہے، مولانا سیاح الدین کاکاخیل مرحوم نے بتلایا کہ حجۃ اللہ البالغۃ میں علل ترغیبی وترہیبی ہیں، ان سے اجتہاد واستنباط کرنا ممکن نہیں اور ہدایہ کے علل سے اجتہاد واستنباط کرنا ممکن ہے، کیونکہ وہ بتلاتے ہیں کہ یہ مسئلہ کیوں ہے؟ وغیرہ۔

اقول: دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ’’ہدایہ‘‘ میں علل واسباب کا بیان ہے اور ’’حجۃ اللہ البالغۃ‘‘ میں حِکَم واسرار کا بیان ہے۔ احکام کا مدار علل واسباب پر ہوتا ہے، حِکَم واسرار پر نہیں، اس لیے کہ علل احکام سے مقدم اور حِکَم مؤخر اور زوائد وفوائد کی قبیل سے ہوتی ہیں۔ یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ عموماً علل اور حکم کے درمیان فرق نہ کرنے کے نتیجے میں بہت سے خلجانات پیدا ہوتے ہیں۔ (ازمرتب)

☆:...... حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اجتماعی طور پر ایصالِ ثواب کرنے کا شرعاً ثبوت نہیں ہے، البتہ انفرادی طور پر ہر شخص اپنے طور پر بخش دے تو بہتر ہے اور اس کا شرعاً ثبوت بھی ہے۔ ہمارے معاشرے میں اجتماعی ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے، اور آخر میں ایک قاری صاحب

بآ وازِ بلند قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں اور پھر دعا کرتے ہیں، اس کا کیا مقصد ہے؟ کیا باقیوں کی تلاوت بے کار ہے؟ ہم نے خود یہ چیزیں بنائی ہیں، کوئی ناراض ہو یا راضی، صحیح بات یہی ہے۔

☆ :......اگر امامت کرنے والے میں تین صفات ہوئیں تو قیامت تک امام رہے گا:

۱:......مستغنی ہونا۔

۲:......متواضع اور خوش اخلاق ہونا۔

۳:......لوگوں کی سیاست اور سیاسی مسائل میں حصہ نہ لینا۔

☆ :......روزہ کی علت اللہ تعالیٰ نے تقویٰ بیان فرمائی ہے: ''لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ '' لہٰذا اب جو چیز بھی خلافِ تقویٰ ہے وہ ممنوع ہے، چنانچہ غیبت اور جھوٹ تقویٰ کے منافی ہیں، اس لیے ممنوع ہیں۔

☆ :......حضرت مولانا طارق جمیل صاحب دامت برکاتہم جامعہ میں ۱۱/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۴ھ مطابق ۱۰/اگست ۲۰۰۳ء کو تشریف لائے، ہمارے دورہ حدیث کا سال تھا، حدیث کی اجازت بھی مرحمت فرمائی، اگلے دن استاذ محترم نے درسگاہ میں فرمایا: ''مولانا طارق جمیل صاحب نے ایک بات بہت عمدہ فرمائی کہ جس چیز کا شر غالب ہو اس کو نہ کرو اور جس کا خیر غالب ہو اس کو کرو۔ پھر استاذ محترم نے فرمایا کہ ہم خیر کے کام کو نہیں کریں گے تو شر غالب آئے گا، تبلیغ کے کام میں خامیاں ہوں گی، مگر اس کی خیر غالب ہے۔''

☆ :......قرآن کریم میں چار قسم کے امتحانات کا ذکر ہے:

تقویٰ کا امتحان......''أُولٰئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَہُمْ لِلتَّقْوٰی''

مصائب کا امتحان......''وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ''

علم کا امتحان......''إِذَا جَاءَکُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُہَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوْہُنَّ''

عمل کا امتحان......''أَیُّکُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً''

☆ :......کوئی آدمی صرف بخاری شریف کو ''فتح الباری'' کے ساتھ دو سال پڑھے تو اس کو بقیہ کتب صحاح کی ضرورت نہیں، زیادہ سے زیادہ فقہ مقارن کے لیے ترمذی کو دیکھے تو اس میں کچھ رجال کے بارے میں معلوم ہوگا، اس کے ساتھ ''عارضة الأحوذی'' رکھ لے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑا کوئی علم میں نہ ہوگا۔

☆ :......امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ مطالعہ، تلاوت وغیرہ جو آپ کو نماز سے روک دے، اس میں ثواب نہیں۔

☆ :......میرے استاذ مفتی محمد فرید صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم اکوڑہ والے فرماتے ہیں کہ بچہ بڑا ہو کر ہوشیار ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے باپ کو کیا آتا ہے، اس کو تو کمر بند کھولنا بھی نہیں آتا، میں کہتا ہوں

کہ اگر تیرے باپ کو کمر بند کھولنا نہ آتا تو تُو نہ آتا، جیسے آج کے دور میں مضمون لکھنے والا اردو میں چند انگریزی کے الفاظ لکھتا ہے، تاکہ معلوم ہو کہ وہ دقیانوسی نہیں ہے، بلکہ اسکالر ہے، اسی طرح گزشتہ دور میں اپنی کتابوں میں منطق لانا فیشن تھا، تاکہ معلوم ہو کہ لکھنے والا اونچا آدمی ہے اور عقلی دلائل جانتا ہے۔

☆ :....... یہ غلط ہے کہ ملائکہ مجرد عن المادہ ہیں، صحیح بات یہ ہے کہ ان کا مادہ موجود ہے، قرآن کریم میں ہے: ''أُولِیْ أَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَ ثُلَاثَ وَرُبَاعَ۔''

☆ :.......کون کہتا ہے کہ اصولِ فقہ کی کتاب تلویح شرح ہے، یہ شرح نہیں بلکہ حاشیہ ہے۔ کافیہ کو برباد کیا تحریر سنبٹ نے اور سلم کو برباد کیا اردو کی لمبی لمبی تقریروں نے کہ مقصد ہی فوت ہوگیا۔

☆ :.......علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ بڑے لطیف انداز میں حنفیوں پر رد کرتے ہیں اور حوالہ بھی ذکر نہیں کرتے، مجھے اسی وجہ سے مرجانیؒ بہت پسند ہے کہ وہ ان کا ادب کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔

☆ :.......قدیم فلسفہ میں اجسام کی طبیعت سے بحث کی جاتی ہے کہ وہ متحرک ہے یا ساکن، اس کی حرکت وسکون کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں، جدید فلسفہ میں اس سے بحث ہے کہ اس جسم سے ہمیں کیا فائدہ ہے؟ یہ ہمارے کام کی چیز ہے، اس کے ذریعے تعلیماتِ قرآن وحدیث کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

☆ :.......انگریزی زبان میں اشتراک زیادہ ہے اور یہ لغت کا دامن تنگ ہونے اور قحط زدہ ہونے کی علامت ہے اور عربیت میں ترادف زیادہ ہے اور یہ لغت کا دامن وسیع ہونے کی علامت ہے، عربی میں سمجھانا بنسبت انگریزی کے زیادہ آسان ہے۔

☆ :.......صاحب کشاف نے ''أساس البلاغة'' لکھی جو کہ لغت پر مشتمل ہے، نہ کہ بلاغت پر، چونکہ بلاغت کی بنیاد لغت پر ہے اس وجہ سے اس کو ''أساس البلاغة'' کہا جاتا ہے، لیکن ہمارے طلبہ آج کل لغت سے ناآشنا ہوتے ہیں، ان کو اس طرف توجہ دلائی نہیں جاتی۔

تزکیہ وتربیت سے خالی تعلیم کے نقصانات

جناب عتیق الرحمٰن

رب کریم نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فرماتے ہوئے پہلی وحی جو نازل کی اس میں تعلیم کی اہمیت، اس کے مقاصد اساسیہ اور اس کے حصول کے ذرائع کو شاندار انداز میں بیان کردیا: ''پڑھ اپنے رب کے نام سے جو پیدا کرنے والا ہے، پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے، پڑھ عزت والے رب کے نام سے، وہ جس نے تعلیم سکھائی قلم کے ذریعہ سے، انسان کو وہ تعلیم دی جس کو وہ نہیں جانتا تھا۔'' سورۂ علق کی ان پانچ آیات میں تعلیم اور اس کے مشتقات اور اس کے اغراض و مقاصد کو کھلے انداز میں بیان کردیا گیا۔

امتِ محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا رشتہ علم کے ساتھ ایسا وابستہ کردیا گیا ہے کہ وہ کبھی بھی چھوٹ نہیں سکتا، بالاضافہ اس بات کے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کائنات کی تمام مخلوقات پر جو فضیلت دی اس کا بنیادی سبب بھی علم ہی ہے، اسی بنا پر فرشتوں کو انسان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا گیا، سورۂ بقرہ میں اس مکالمہ کا ذکر موجود ہے جو اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے مابین ہوا، اللہ رب العزت نے جب فرشتوں کے علم کا امتحان لیا تو وہ عاجز ہوگئے اور حضرت آدم علیہ السلام کامیاب ٹھہرے، بالآخر فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا، یہ فضیلت ومنزلت علم ہی کی وجہ سے حاصل ہوئی کہ انسان مسجودِ ملائک بنا۔

سورۂ علق کی آیات میں واضح طور پر بتادیا گیا ہے کہ علم وہی علم ہے جس میں رب کائنات کی رضا کا حصول مضمر ہو۔ دنیا کا کوئی علم فی نفسہٖ مضر یا نقصان دہ نہیں ہے، ہاں! جب اس کی ٹہنی کو غیراللہ کی جانب سے حرکت دی جائے گی، اور اس کو حاصل کرنے کا مقصد دنیا میں خود کو مستعلی کرنا ہوگا، ظلم وستم کا راستہ اختیار کرکے کمزور وناتواں لوگوں پر مصائب ڈھائے جائیں گے، یا علم کو حاصل کرنے کے بعد انسانیت کے حقوق کو غصب کیا جائے گا، یا علم کے آجانے کے بعد مادر پدر آزادی کی لہر کو فروغ دیا جائے گا، یا پھر اسلامی تعلیمات اور اس کی تہذیب وثقافت کو کمتر جانتے ہوئے غیراللہ کی اندھی تقلید کی جائے گی تو ایسے میں لازم ہوگا کہ یہ علم فائدہ دینے کی بجائے انسانیت کو ہلاکت کی تہوں میں داخل کرنے کا موجب ہوگا، جیسا کہ عصرحاضر کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ انسان نے خود ہی اپنی ہلاکت کا سامان تیار کرلیا ہے۔ پہلی ودوسری

www.banuri.edu.pk

جنگیں اس بات کی شہادت ہیں اور اسی طرح ایٹمی مواد کے تیار ہو جانے کے بعد دنیا کا ہر گوشہ غیر محفوظ ہو چکا ہے۔ اسی وجہ سے سورۂ علق کی پہلی دو آیات میں علم کے حصول اور اس کے عظیم رب کے ساتھ رشتہ و تعلق کی اہمیت کے ساتھ انسان کو بتا دیا گیا ہے کہ انسان کو تکبر و گھمنڈ کا رویہ اختیار کرنے کی چنداں حاجت نہیں، کیوں کہ انسان کی اصل و اساس پانی کے ایک گندے قطرے کے بعد خون کے لوتھڑے سے زیادہ کچھ بھی نہیں، تاوقتیکہ وہ اپنی بعثت و تخلیق کے مقصد پر اپنی زندگی بسر کرنا شروع نہ کر دے۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ ''ہم نے پیدا نہیں کیا انسان کو مگر اپنی عبادت کی خاطر۔'' احادیث مبارکہ میں بھی حصول علم کی اہمیت اور اس کے مقصد و مطلب کو واضح کیا گیا ہے۔ ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے''..... ''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں''..... ''اے اللہ! علم نافع عطا فرما'' جیسی بے شمار احادیث نبویہ اور دعائیں موجود ہیں۔

تیسری آیت میں بیان کر دیا گیا ہے کہ پڑھنے کے بعد واجب ہے کہ ہم انسانیت کے ساتھ متواضع رویہ کو اختیار کرتے ہوئے ان کے ساتھ بھلائی و ہمدردی اور نیکی و تکریم کا تعلق استوار کریں، کیوں کہ جو علم اُسے دیا گیا ہے یہ علم کریم وعزت والے رب کی جانب سے ملا ہے، اس علم کو انسانیت کی خدمت اور ان کی دست گیری کا ذریعہ بنانا چاہیے، نہ کہ اس کے بعد انسان مارے غرور کے حیوانیت کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے صرف اپنے مفادات کے تحفظ کو تو یقینی بنائے، چاہے اس کے سبب دوسروں کے گھر ویران و تاریک ہوتے ہوں، گویا کہ اس آیت میں اللہ رب العزت انسان کا تزکیہ فرما رہے ہیں کہ علم کے حصول کے بعد مادہ پرستی کا دامن نہ تھام لینا اور اس کے ساتھ سرکشی و بڑائی کو اپنا شعار نہ بنا لینا، کیوں کہ اسی کے سبب شیطان کو تا قیامت مردود اور جن وانس اور کائنات کی تمام مخلوقات کی لعنت کا مستحق بنا دیا گیا۔

چوتھی اور پانچویں آیت میں اول تو علم کے حاصل ہونے کے اہم ترین ذریعہ کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ آگے واشگاف الفاظ میں اللہ نے انسانیت کی استعداد و صلاحیت کی بنیاد کو بیان کر دیا کہ جو کچھ تم جانتے ہو وہ ہم نے تم کو بتایا اور سکھلایا، وگرنہ تم تو جانتے ہی نہ تھے۔ اس بات کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کو اپنا سینہ اس بات پر چوڑا کرنا چاہیے جو اس کی اپنی تخلیق ہو اور وہ چیز کسی اور کے پاس موجود نہ ہو اور اس نے یہ کسی کی مدد و نصرت کے بغیر حاصل کیا ہو اور ایسا ہونا ممکن ہی نہیں، لہٰذا امر واقع ہے کہ انسان عاجزی کو اپنائے۔

مندرجہ بالا گزارشات کو درج کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام وہ دین متین ہے جس نے نہ صرف علم کی اہمیت کو بانگ دہل بیان کیا اور اس کے حصول پر زور دیا، بلکہ اس کے حدود دِاربعہ کو بھی متعین کر دیا کہ یہ حد فاصل ہے علم رحمانی اور علم شیطانی کے مابین۔ جو علم رحمانی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لے گا وہ ہمیشہ کے لیے کامیاب ہو جائے گا، ورنہ ابدی لعنت اور ناکامی کا مستحق ٹھہرے گا۔

اللہ جل جلالہٗ نے قرآن کریم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے

www.banuri.edu.pk

کہ: ''ہم نے ''اُمّیّین'' (اَن پڑھ) میں رسول بنا کر بھیجا انہیں میں سے، وہ تلاوت کرتے ہیں آیات کی اور تزکیہ کرتے ہیں، تعلیم دیتے ہیں کتاب وحکمت کی.....الخ'' اس آیت میں اور اس جیسی دیگر آیات میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی چار صفات کا ذکر کیا ہے جن کی تعلیم دینا آپ ﷺ کے فریضہ میں شامل تھا۔

اول:.....آیات کی تلاوت۔ ثانی:.....تزکیہ۔

ثالث:.....تعلیم کتاب۔ رابع:.....تعلیم حکمت ودانشمندی۔

علم کا رشتہ جب تک تزکیہ کے ساتھ استوار وقائم رہے گا، اس علم کے ذریعہ انسان عروج کے اقبال تک پہنچے گا اور جب علم سے تزکیہ کے رشتہ کو کاٹ دیا جائے گا تو یہ علم ضلالت وگمراہی اور انسانیت کی کشتی کو ڈبو دینے کا سبب بھی بن جائے گا اور اس کے ساتھ ہی اللہ کی ناراضگی ہمیشہ کا مقدر بن جائے گی۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج کل کے تمام تعلیمی ادارے بالخصوص حکومتی وعصری تعلیمی اداروں کا رشتہ تزکیہ سے کٹا ہوا ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ طالب علم استاذ پر دست درازی، والدین، اساتذہ، بڑوں، دوستوں اور رشتہ داروں کی عزت وتکریم سے تہی دامن ہو چکا ہے اور اسی کا بدیہی ومشاہداتی نتیجہ ہے کہ معاشرہ عدم اطمینان کی کیفیت سے دوچار ہے اور کرپشن، لوٹ مار، چور بازاری، دھوکہ دہی وبد دیانتی کا رواج عام جاری وساری ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ علمی چوری، مالی خیانت جیسے گھناؤنے جرائم کو بھی عزت ومنزلت کے حصول کے لیے کرگزرنے میں کوئی حجاب نہیں کرتے۔ آئے روز اخبارات وٹی وی پر خبریں چلتی ہیں کہ فلاں مقام پر فلاں طالب علم یا فلاں طالبہ نے خودکشی کرلی ہے اور اس کے متعدد اسباب بیان کیے جاتے ہیں کہ محبت میں ناکامی پر یا گھریلو ناچاقی پر، شادی بالجبر کے اندیشے پر خودکشی کی گئی ہے، مگر ایک اہم نکتہ کو ہمیشہ نظروں سے اوجھل رکھا جاتا ہے کہ اس حد تک پہنچنے کا ذریعہ کونسا سبب بنا ہے؟ شاید کبھی کسی نے اس پر غور کرنا مناسب نہیں سمجھا، جبکہ بانجھ وغیر مؤثر اور ناکارہ تعلیم جو تزکیہ وتربیت سے خالی ہوگی کو حاصل کرنے والے طالب علم یا طالبہ سے آپ یہ کیسے امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ اخلاقیات سے عاری سرگرمیوں اور یورپ ومغرب کی تقلید میں مشغول ہوتے ہوئے عشق ومعاشقہ کی لعنت سے دور رہ سکتے ہیں۔ تعلیم وہ مطلوب ہے جو تزکیہ وتربیت کے ساتھ مربوط ہو اور استاذ صرف کتاب کو رَٹوانے یا اَزبر کروانے اور امتحانات میں کامیابی کے چور راستے بتانے کا مکلّف نہیں، بلکہ یہ وہ منصب ہے کہ جس پر فائز ہونے والے کی ابدی کامیابی کا انحصار اور معاشرے کی ترقی وفلاح کا منبع تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات ہوتے ہیں۔ اگر ان کی خط مستقیم پر رہنمائی ونگہبانی نہیں کی گئی تو مسلم معاشرہ ہمیشہ کی ذلت ورسوائی میں مبتلا ہو جائے گا، جس کا آغاز بڑی سرعت کے ساتھ ہو چکا ہے، اس کے سامنے بند باندھنے کا واحد ذریعہ تعلیم ہے اور وہ تعلیم جس کا تعلق ورشتہ تزکیہ وتربیت کے ساتھ اَٹوٹ ہو۔

اسلام میں یتیم و نادار بچوں کی کفالت

مفتی محمد فیاض قاسمی (انڈیا)

معاشرہ میں رہنے والے قبیلے، خاندان اور برادریاں گو بہ طور شناخت ایک دوسرے سے ممتاز ہوتی ہیں، ان کی رہائش، ان کا معاش اور ان کا تمدن جداگانہ ہوتا ہے، تاہم بحیثیت معاشرت سبھی ایک ہوتے ہیں۔ غم اور خوشی میں شریک ہونا ان کا اخلاقی فریضہ ہوتا ہے۔ حوادثِ زمانہ کے تھپیڑے کھائے ہوئے لوگوں کی دیکھ بھال اور ان کی ضروریات کی تکمیل کو وہ اپنی سماجی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور کم و بیش سماج کے لوگ اس ذمہ داری کو اس لیے بھی نبھاتے ہیں کہ وہ ان کے لیے گراں بار نہیں ہوتے، لیکن آج کے دور کا سب سے بڑا مسئلہ سماج کے یتیم بچوں کی کفالت ہے۔ معاشرہ کے صاحب حیثیت اور متمول حضرات کے بھی قدم اس موڑ پر آ کر رک جاتے ہیں، کیوں کہ ان کے سامنے یتیموں کا صرف پیٹ بھرنا ہی ایک ضرورت نہیں، بلکہ ان کی مکمل نگہداشت، تعلیم و تربیت اور ساری ضروریات کی تکمیل ایک لمبے عرصہ کی متقاضی ہوتی ہے۔ یہی سوچ کر گویا ہر ایک اپنے کو بری الذمہ قرار دیتا ہے، جس کے نتیجہ میں ان بچوں کی زندگیاں یوں ہی ضائع ہو جایا کرتی ہیں۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، اس میں ہر ایک کے حقوق کا خیال رکھا گیا ہے۔ اللہ پاک نے کسی کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا۔ ہر ایک کے لیے ایسے اسباب و ذرائع مہیا کر دیے ہیں کہ وہ آسانی کے ساتھ اللہ کی زمین پر رہ کر اپنی زندگی کے ایام گزار سکے۔ یتیم و نادار اور لاوارث بچوں کے بھی معاشرتی حقوق ہیں، ان کی مکمل کفالت، ان کے حقوق کی پاسداری ہے اور ان سے منہ موڑ لینا ان کے حقوق کی پامالی ہے۔

یتیم و نادار بچوں کی دو حیثیتیں ہو سکتی ہیں: ۱:.....ان کے پاس مال ہو، ۲:.....ان کے پاس مال تو نہ ہو، لیکن ان کے عصبات، قریبی رشتہ دار یا ذوی الارحام میں سے کوئی موجود ہو۔ پہلی صورت میں یعنی اگر ان کے پاس مال ہے، تو ان کی پرورش و کفالت ان کے مال ہی سے کی جائے گی، خواہ ان کا کفیل کوئی قریبی رشتہ دار یا ذوی الارحام یا کوئی غیر ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پوری احتیاط کے ساتھ ان کا مال ان پر خرچ کرے اور ان کی تربیت وغیرہ کا بھی خاص خیال رکھے۔ قرآن کریم نے تاکید کی ہے کہ ان کا مال پوری ایمانداری کے ساتھ اُنہیں پر خرچ کرو، اپنی ذات میں ہرگز ان کا مال استعمال نہ کرو: ''وَلَاتَاكُلُوْا أَمْوَالَهُمْ إِلٰى أَمْوَالِكُمْ إِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْراً ۔'' (النساء:۲) اور جب بالغ ہو کر سوجھ

بوجھ والے ہوجائیں، نفع ونقصان کی تمیز ان کے اندر آجائے تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو: ’’فَإِنْ أَنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْداً فَادْفَعُوْا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ۔‘‘ (النساء:۶)

دوسری صورت جب کہ ان کے پاس مال نہیں ہے، لیکن ان کے عصبات یا ذوی الارحام موجود ہیں، تو پھر ان کی پرورش وپرداخت کے ذمہ دار یہی حضرات ہوں گے، البتہ ان میں یہ ترتیب ہوگی کہ عصبات میں زیادہ حق دار وہ ہوں گے جو رشتہ میں زیادہ قریب ہوں گے اور اگر عصبات موجود نہ ہوں تو ذوی الارحام ان کی کفالت کریں گے اور ان میں بھی قریبی رشتہ داری کو ترجیح دی جائے گی:

’’وإذ لم يكن للحاضن أحد ممن ذكر انتقلت الحضانة لذوي الأرحام في أحد الوجهين وهو الأولٰى، لأن لهم رحمًا وقرابةً يرثون بها عند عدم من هو أولٰى، فيقدم أبو أم، ثم أمهاته، ثم أخ من أم، ثم خال۔‘‘ (الموسوعۃ الفقہیہ، ج:۱۷،ص:۳۰۵)

ہاں! اگر عصبات اور ذوی الارحام میں سے کوئی موجود نہ ہو تو پھر حاکم وقت ان کو کسی مسلمان کے سپرد کردے گا، تاکہ وہ اس کی پرورش کرے اور اس کا خرچ بیت المال برداشت کرے گا:

’’ثم حاكم يسلمه إلى من يحضنه من المسلمين۔‘‘ (الموسوعۃ، ج:۱۷،ص:۳۰۵)

البحر الرائق میں ہے کہ: اگر والدین فقیر ہوں تو باپ لوگوں سے بھیک مانگ کر اپنے چھوٹے بچوں پر خرچ کرے گا اور ایک قول یہ ہے کہ باپ کو بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں، بلکہ ان بچوں کا نفقہ بیت المال کے ذمہ ہے:

’’إن كان فقيرين فعند الخصاف أن الأب يتكفف الناس وينفق على أولاده الصغار، وقيل نفقتهم في بيت المال۔‘‘ (البحر الرائق، ج:۴،ص:۲۰۱)

معلوم ہوا کہ مذکورہ ترتیب کے اعتبار سے اگر ان لاوارثوں کی کفالت کے ذرائع موجود نہ ہوں تو ان کی کفالت بیت المال کے ذمہ ہے، لیکن ہندوستان جیسے ممالک میں بیت المال کی سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے ان کی کفالت کا مسئلہ قابل غور ہے۔ بیت المال کے بجائے شرعی تنظیمیں الحمد للہ! ہندوستان کے طول وعرض میں کسی نہ کسی شکل میں امت کے مسائل پر نظر رکھ رہی ہیں اور مسلمان اس امارت کے تابع ہوکر احکام شریعت پر عمل کرتے ہیں، لہٰذا اس صورت میں شرعی امارتوں کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ ان یتیم بچوں کی کفالت کا انتظام کرے، خواہ اس کے لیے جو بھی مناسب شکل اختیار کرنی پڑے، مثال کے طور پر ان بچوں کو اپنی تنظیم کے تحت چل رہے کسی ہوسٹل ویتیم خانہ میں رکھ کر ان پر امت مسلمہ کی طرف سے آئی ہوئی مدات خرچ کرے، یا پھر جہاں وہ بچے ہیں وہیں کے کسی فرد مسلم کو متعین کردے کہ وہ ان کی دیکھ ریکھ اور پرورش کرے اور ان بچوں پر خرچ کرنے کے لیے ہفتہ، مہینہ یا سال کے اعتبار سے رقم اس شخص کو ادا کرے۔ غرض بیت المال نہ ہونے کی بنا پر شرعی تنظیمیں ان کا انتظام کریں گی۔

اور اگر شرعی تنظیمیں بھی نہ ہوں یا ان کی طرف سے اس طرح کا انتظام نہ ہوسکتا ہو، تو بھی ایسے بچوں کی کفالت خود اسی علاقہ کے مسلمانوں کے ذمہ ہوگی جہاں اس قسم کے یتیم ونادار بچے ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا:

’’مَنْ ذَاالَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضَاعِفَہٗ لَہٗ أَضْعَافًا کَثِیْرًا۔‘‘
’’کون ہے جو اللہ پاک کو بہترین قرض دے تاکہ اللہ اس کے لیے اسے اور بھی زیادہ بڑھادے۔‘‘
’’یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَۃٍ (الآیۃ) أی قرابۃ کما أن الصدقۃ علی الیتیم الذی لا کافل لہٗ أفضل من الصدقۃ علی الیتیم الذی یجد من یکفلہ۔‘‘ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، ج:۲۰،ص:۶۹)
’’عن ابن عباسؓ أن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم أنا وکافل الیتیم لہٗ ولغیرہٖ فی الجنۃ ھکذا وأشار بالسبابۃ والوسطٰی وفرج بینھما شیئًا۔‘‘ (بخاری جلد:۲)
’’أی ان الیتیم سواء کان الکافل من ذوی رحمہٖ وأنسابہٖ أو کان أجنبیًا لغیرہ یکفل بہٖ۔‘‘ (شرح الطیبی، ج:۱۰،ص:۳۱۷۶، للشیخ شرف الدین الحسین الطیبی، مطبع مکۃ المکرّمہ الریاض)

یہ ساری آیات واحادیث گرچہ یتیم کی کفالت کے سلسلہ میں ترغیب وفضائل کی ہیں، تاہم منجملہ ان سے یہ بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ اس طرح کے نادار، لاوارث اور یتیم بچوں کی کفالت مسلمانوں کے ذمہ ہے اور حسب سہولت علاقہ اور محلّہ کے افراد پر یہ ذمہ داری عائد ہوگی۔ ان بچوں کو یوں ہی ضائع ہونے نہیں دیا جائے گا۔ اگر کچھ لوگ اس ذمہ داری کو بہ طور کفایہ نبھالیتے ہیں، تو سب بری الذمہ ہوجائیں گے، ورنہ سب کے سب مسئول ہوں گے۔ **(بشکریہ ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند)**

www.banuri.edu.pk

بچوں کی پرورش سے متعلق احتیاط اور تدابیر

مولانا محمد عاصم مخدوم

بچوں کے لیے سب سے بہتر غذا ماں کا دودھ ہے، بشرطیکہ ماں کے دودھ میں خرابی نہ ہو۔ اگر ماں کا دودھ کسی بیماری کی وجہ سے خراب ہو تو سب سے مضر ماں کا دودھ ہے۔ تندرست ماں اگر خالی پستان بھی بچے کے منہ میں دے تو بچے کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اگر یہ عادت بنالیں کہ ہر دفعہ دودھ پلانے سے پہلے ایک انگلی شہد چٹا دیا کریں تو بہت مفید ہے۔ بچے کو کبھی بھی منہ کے بل نہ سونے دیا جائے، یہ بہت بری عادت ہے اور اس سے سانس رک جانے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ اگر ماں دیکھے کہ اس کا بچہ منہ کے بل سو رہا ہے تو فوراً ہی اسے سیدھا کردے۔ بہتر ہے کہ بچے کو دائیں کروٹ سونے کا عادی بنایا جائے۔ جب بچہ سو رہا ہو تو اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا جائے کہ اس کا منہ بستر کے کسی کپڑے سے نہ ڈھکا ہو۔ اگر ماں بچے کے منہ کو کپڑے سے ڈھکا ہوا دیکھے تو منہ پر سے فوراً کپڑا ہٹا دے، کیونکہ کپڑے سے منہ بند ہو جانے کی وجہ سے سانس کے رک جانے کا خطرہ رہتا ہے۔

کھانے پینے اور دوسری عادتوں کی طرح سونے کے آداب واطوار اور نیند میں باقاعدگی اور سلیقہ مندی کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ پانچ چھ مہینے تک بچہ عموماً بیس گھنٹے سوتا ہے، چھ ماہ اور ایک سال کی عمر کے درمیان عموماً سولہ گھنٹے سوتا ہے۔ بتدریج سونے کی مدت کم ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ بچہ پانچ سال کا ہونے پر بارہ گھنٹے سوتا ہے۔

بچے کے آرام کے اوقات میں اس کے بول وبراز کے اوقات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔ شیر خوار بچہ عمر کے لحاظ سے عموماً آٹھ بار سے سولہ بار تک پیشاب کرتا ہے اور دو بار سے چھ بار تک پاخانہ کرتا ہے۔ اگر بچے کو ہر ڈیڑھ گھنٹے کے بعد پیشاب کے لیے اور ہر تین یا چار گھنٹے کے بعد پاخانے کے لیے بیدار کیا جائے تو بستر بھی نہیں خراب کرے گا اور بچے کو بھرپور آرام اور سونے کا موقع بھی مل جائے گا۔ اگر ماں یا دائی اوقات کی پابندی کرے تو خود بھی تکلیف سے بچ سکتی ہے اور

بچہ بھی سکون سے سو سکتا ہے۔ (از: بچوں کی تربیت کیسے کریں؟،ص:۱۵۹)

بچہ جس وقت سے پیدا ہوتا ہے اس کا دماغ کیمرے کی سی خاصیت رکھتا ہے، جو کچھ دیکھتا ہے، سنتا ہے، وہ محفوظ کرتا رہتا ہے، اس کے سامنے دوسرے کسی بچے کو بھی زور سے ڈانٹنا نہیں چاہیے۔ جتنا تمیز سلیقے سے باتیں کریں گے اتنا ہی یہ بھی سلیقہ اور تمیز سے بات کرنا سیکھے گا۔ بچے کے سامنے کوئی بری بات، آواز نہ نکالیں، ذکر کرتی رہیں، دعائیں پڑھتی رہیں۔

جب دودھ چھڑانے کے دن نزدیک آجائیں اور بچہ کھانے لگے تو اس کا خیال رکھیں کہ کوئی سخت چیز ہرگز نہ چبانے دیں، اس سے ڈر ہے کہ دانت مشکل سے نکلیں اور ہمیشہ کے لیے دانت کم زور رہیں گے۔ اسی طرح چاکلیٹ، سویٹ، گھٹیا قسم کی ٹافیوں وغیرہ کی بجائے گھر کی بنی ہوئی اچھی اور صاف ستھری چیزیں دیں۔ ایسی حالت میں نہ غذا پیٹ بھر کر کھلائیں، نہ پانی زیادہ پلائیں، اس سے معدہ ہمیشہ کے لیے کمزور ہوجاتا ہے۔ اگر ذرا بھی پیٹ پھولا دیکھیں تو غذا بند کردیں اور جس طرح ہو سکے بچے کو سلادیں، اس سے غذا جلدی ہضم ہوجاتی ہے۔ ایسی حالت میں بدہضمی سے بچانے کا خاص خیال رکھیں۔

جب مسوڑھے سخت ہوجائیں اور دانت نکلتے معلوم ہوں تو سر اور گردن پر تیل خوب ملا کریں اور کبھی کبھی شہد دو دو بوند نیم گرم کر کے کانوں میں ڈال دیا کریں کہ میل نہ جمے اور لیڈی ڈاکٹر سے پوچھ کر ایسی دوا کا استعمال کریں کہ دانت آسانی سے نکلیں، کبھی دانتوں کے مشکل سے نکلنے کی وجہ سے بچے کے ہاتھ جسم اینٹھنے لگتے ہیں، اس وقت سر اور گردن پر تیل ملیں اور کبھی کبھی نمک اور شہد ملا کر مسوڑھوں پر ملتے رہیں، اس سے منہ نہیں آتا اور دانت بھی بہت آسانی سے نکلتے ہیں۔ جب بچے کی زبان کچھ کھل چکے تو کبھی کبھی زبان کی جڑ کو انگلی سے مل دیا کریں، اس سے بہت جلدی صاف بولنے لگتا ہے۔ (ماخوذ از خلاصۂ بہشتی زیور، ص:۴۷۲)

حکمت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ بری عادتوں سے بھی تن درستی خراب ہوجاتی ہے، لہٰذا بچے کی عادتیں درست رکھنے کا بہت خیال رکھیں، جتنا آپ اس ایک بچے کا خیال رکھیں گی، اس کی صحیح تربیت کریں گی تو یہ بچہ کل بڑا ہوکر جو بھی اچھا کام کرے گا اور دنیا میں اس کی وجہ سے جتنی خیر اور بھلائیاں وجود میں آئیں گی، آپ ان کا سبب بنیں گی۔ خصوصاً پانچ سال سے کم عمر بچوں کے لیے اور بچوں کی جتنی اچھی تربیت ہوجاتی ہے اتنی ہی زیادہ بچے اخلاق سے بہرہ مند اور صحت مند ہوتے ہیں۔

www.banuri.edu.pk

مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخی خدمات

(قسط:۱)

مفتی محمد رضا انصاری

فرنگی محل کے نامور عالم دین مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحی انصاری رحمۃ اللہ علیہ وفات: ۱۸۸۶ء-۱۳۰۴ھ کی جو عظیم شہرت برصغیر ہندوپاکستان اور براعظم ایشیا میں ہوئی اور آج تک ہے وہ محدث، فقیہ، متکلم، معقولی، صاحب افتاء اور مستند حنفی کی حیثیت سے ہے، تذکرہ نویس، ماہر اسماء الرجال اور مؤرخ کی حیثیت سے نہیں ہے اور یہ حیثیت معاصر اربابِ علم وصاحبانِ تصانیف کے رجحان کو دیکھنے میں من جملۂ نوادر تھی، ان کا بلند مرتبہ ان کے عہد میں زیادہ قابل توجہ نہیں سمجھا گیا، اس عہد کا مزاج ہی یہ تھا کہ عالم دین کے لیے مؤرخ یا تذکرہ نویس ہونا، نہ سببِ امتیاز تھا نہ قابل ذکر اور جسے تذکرہ نویس مان لیا گیا اُسے مستند عالم دین کا درجہ دینا کم ہی گوارا کیا گیا۔ مولانا فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مختصر عمر (۱) میں جو شمسی کیلنڈر کے اعتبار سے صرف ۳۸ سال دو ماہ اور تین دن تھی، بڑی چھوٹی سو سے زیادہ تصانیف کیں، جو مصنف کے سامنے ہی طبع ہوکر دور دور تک رائج ہوگئی تھیں۔ (۲) مولانا کی کثرتِ تصانیف کے سلسلے میں شام کے ایک عالم اور محقق مفتی عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کا خیال یہ ہے کہ:

> ''جب بھی ان بڑے بڑے مصنفوں کا ذکر کیا جائے گا جن کی تصانیف پچاس یا سو سے متجاوز ہیں تو بلاشبہ امام عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر سرفہرست ہوگا، اس لیے کہ ان کی تصانیف کی تعداد ایک سو چودہ تک پہنچ گئی ہے اور اگر ان کی مختصر عمر کی نسبت سے ان کی تصانیف کا حساب کیا جائے گا تب تو یہ بہت زیادہ ثابت ہوں گی۔ میں نے ان کی بیشتر تصانیف جمع کرلی ہیں، جو رہ گئی ہیں ان کو بھی حاصل کرنے کی کوشش میں ہوں اور میرا حتمی ارادہ ہے کہ ان کی ان مفید اور کثیر تصانیف کے صفحات کا شمار کرکے ان کی عمر کے ایام پر اُنہیں تقسیم کروں، اس طرح تصنیف وتالیف میں ان عظیم الشان اور نادرالوجود مہارت کا انکشاف ہوسکے گا، میرا تو خیال ہے کہ اس طرح حساب لگانے سے ان تمام بڑے بڑے مصنفین پر- جن کی عمریں لمبی ہوئیں اور جنہوں نے بڑی تعداد میں تصانیف چھوڑی ہیں جیسے علامہ ابن جریرؒ، علامہ ابن جوزیؒ اور امام فخر الدین رازیؒ وغیرہ- امام عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس لحاظ سے فوقیت

حاصل ہوگی کہ ان کی روزانہ لکھنے کی مقدار سب سے زیادہ نکلے گی۔'' (۳)

منطق، فلسفہ، مناظرہ، کلام، نحو، صرف، حدیث، فقہ اور تاریخ وتراجم میں سے ہر موضوع کی مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے خدمت کی اور بجا طور پر انہیں محدث، فقیہ، اصولی، منطقی، بحّاث، نقاد اور مؤرخ کہا جاسکتا ہے۔ سب سے زیادہ خدمت انہوں نے فقہ اور حدیث کی کی، ان دونوں موضوعات پر ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد پچاس کے قریب ہے۔ دوسرے نمبر پر تذکرہ نویسی اور تراجم واحوال سے متعلق ان کی تصانیف ہیں جو ڈیڑھ درجن کے قریب ہیں۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ کی دو پہلوؤں سے خدمت کی:

ا:......علماء ومصنفین کے احوال وتراجم ایک مخصوص نظام کے تحت مرتب کیے۔

۲:......اور فنون وعلوم کی تاریخ بھی قلم بند کی، علوم وفنون کی تاریخ پر ان کے قلم نے اس وقت روشنی ڈالی جب وہ بعض اہم قدیم تصانیف کو اپنے حواشی اور مقدمات کے ساتھ شائع کرانے کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں اس انداز پر شائع کیا جسے موجودہ زبان میں کتاب کا ایڈٹ کرنا کہتے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ تو اس حد تک مدعی ہیں کہ کتاب کو ایڈٹ کرنے کا طریقہ ایجاد ہی مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا، اپنے مضمون ''ہندوستان میں علم حدیث'' میں لکھتے ہیں:

> ''یورپ میں قلمی کتابوں کو ایڈٹ کرنے کو جو اہمیت حاصل ہے اور جس طرح وہ مختلف نسخوں کی فراہمی، مقابلہ، تصحیح اور ساتھ ہی مصنف اور تصنیف کے متعلق ہر قسم کی معلومات مقدمہ میں فراہم کرتے ہیں، مولانا نے یعنی مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے یورپ کے طریقہ کار کے علم سے پہلے ہی اس کام کی طرف توجہ کی اور بالکل اسی طریق پر بلکہ اس سے بہتر طریقے پر اس کو انجام دیا، جس کتاب کو شائع کیا اس کے مختلف نسخوں کو فراہم کیا اور ان کا مقابلہ کرکے ایک صحیح نسخہ ترتیب دیا، پھر اس پر حواشی لکھے، شروع میں ایک مقدمہ لکھا، جس میں ماتن، شارح اور اس کے دیگر شارحین کے حالات لکھے، اس کتاب اور اس فن پر دوسری کتابوں کے حالات ذکر کیے، نفس اس فن کی جس میں یہ کتاب تھی تاریخ لکھی۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے ہی مقدمہ نگاری کی ایجاد کی، مولانا سے پہلے کسی شارح یا محشی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔'' (۴)

اب تو عام دستور بن چکا ہے کہ جس کتاب کو ایڈٹ کیا جاتا ہے، اس سے متعلق تمام تحقیقی مواد کتاب کے شروع میں بطور مقدمہ درج کردیا جاتا ہے۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے بقول علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس دستور کو ایجاد کیا اور معمول بہ بنایا، اس طرز کے ان کے قابل قدر مقدمات ہیں:

ا:.....مقدمة عمدة الرعاية فی حل شرح الوقاية۔ ۲:.....مقدمة موطا امام محمد الموسوم بالتعليق الممجد۔ ۳:.....مقدمة الجامع الصغير المسماة بالنافع الكبير۔ ۴:.....مقدمة الهداية وذيلة الموسومة بمذيلية الدراية۔ ۵:.....اور مقدمة السعاية فی كشف

مافی شرح الوقایۃ ہیں۔

ان کے علاوہ جس چھوٹی بڑی درسی کتاب پر مولانا نے حاشیہ لکھا، اس کے شروع یا خاتمے پر اس کتاب، اس کے مصنف اور تصنیف کے عہد کا ذکر بھی ضرور کیا۔ درسی کتابوں پر لکھے گئے مقدمات کی حیثیت خواہ وہ کتنے ہی گراں قدر رہوں حلقۂ درس میں بہر حال ضمنی سمجھی جاتی رہی ہے، اس لیے کہ درسی کتابوں سے اصل مدعا، کتاب کے مطالب ومباحث سے واقفیت حاصل کرنا رہا ہے، کم از کم مشرقی درسگاہوں نے تو زیر درس کتابوں کے پڑھانے یعنی ان کے مطالب سمجھنے سمجھانے میں اس درجہ انہاک کا ثبوت دیا ہے کہ زیر درس کتاب کے مصنف کا نام تک جاننا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ مصنف کی دوسری تصانیف اور مصنف کے عہد کی خصوصیات سے واقفیت کی بات تو بہت دور کی بات ہے، اس صورت حال کے جو نقصان دہ نتائج برآمد ہوئے ان کی خود مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح نشان دہی کی ہے:

''ہمارے زمانے ہی کے علماء نہیں، ہمارے ملک کے پیشرو بیشتر علماء بھی مصنفین اور علماء کے احوال وتراجم کو حقیر چیز قرار دیتے تھے اور انہوں نے اس اہم (علمی) پہلو کو پس پشت ڈال رکھا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تراجم علماء ان کے لیے گم شدہ خزانہ ہو گئے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نسیاً منسیاً ہو گئے، اس صورت حال کی بدولت ہمارے علماء اندھیرے گڑھے میں جا پڑے اور اندھی سواری کی پیٹھ کے سوار بن گئے۔ ہمارے علماء کا حال یہ ہے کہ متقدمین کی کتابوں میں جن علماء کا ذکر ہے ان کے اصلی ناموں سے بھی یہ ناواقف ہیں، ان کے حالات اور خصوصیات کا کیا ذکر اور ان کی ولادت ووفات سے واقفیت کا کیا سوال؟ کتب فقہ میں مذکور کسی فقیہ کے بارے میں جو لقب یا نسب سے یاد کیا گیا ہے، اگر ان علماء سے یہ پوچھ لیا جائے کہ اس کا نام کیا ہے؟ اس کا کام کیا ہے؟ کس زمانے میں تھا؟ اور کہاں کا رہنے والا تھا؟ تو وہ وحشی جانوروں کی طرح ادھر اُدھر دوڑ بھاگ کرنے لگیں گے اور حیران وپریشان کی طرح مبتلائے فکر ہو جائیں گے، دیکھ لو! اپنی تصانیف میں یہ علماء ایک فقیہ کی تصنیف کو دوسرے فقیہ سے منسوب کر دیتے ہیں، اس مصنف اور دوسرے مصنف کے درمیان ان کو کوئی وجہ امتیاز بھی نظر نہیں آتی، خاص کر جب نام، لقب، نسب اور عہد بھی دونوں مصنفوں کا اتفاق سے ایک ہو تو ہمارے علماء دونوں میں بالکل تفریق نہیں کر پاتے۔ اگر کسی فقہی مسئلے میں علماء کا اختلاف رہا ہے تو ہمارے زمانے کے علماء درجہ اول کے عالم کو درجہ آخر میں اور درجہ آخر کے علماء کو درجہ اول میں محض اپنی واقفیت سے رکھ دیتے ہیں، اقوال مقبول ومردود مشہور وغیر مشہور کے درمیان بھی فرق نہیں کر پاتے۔''(۵)

جس عام ناواقفیت کا نقشہ مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے کھینچا ہے، اگرچہ اس کا عمومی رخ فقہیات کی طرف ہے، لیکن معاملہ وہیں تک نہ تھا، دوسرے علوم وفنون کا حال بھی بعینہٖ یہی تھا اور اس ناواقفیت کے

نقصانات وہاں بھی محسوس کیے جاتے تھے، البتہ فقہ کا معاملہ زیادہ اہم اس بنا پر تھا کہ فن میں متقدمین اور سلف کی آراء متاخرین اور خلف کی آراء کے مقابلے میں زیادہ وزن رکھتی ہیں، اسی لیے مولانا نے اس اہم معاملے کو اپنی اولین توجہ کا مستحق قرار دیا، کیونکہ اس سے دینی ضرورت وابستہ تھی، وہ لکھتے ہیں:

''اس صورتِ حال کے پیشِ نظر میں نے علمائے احناف کے احوال جمع کرنے کی طرف اپنے ارادے کی باگ موڑ دی (اللہ تعالیٰ ہمارے علماء کو اپنے ظاہر اور پوشیدہ الطاف سے مخصوص فرمائے) اس لیے کہ ہمارے معاصر حنفی علماء کو قدیم علمائے احناف کے احوال جاننے کی ضرورت زیادہ تھی، خصوصاً ہمارے ملک میں تو اس کی احتیاج اظہر من الشمس تھی۔''(۶)

علمائے احناف کے احوال میں لکھی جانے والی کتابوں کے مصنفین: عبد القادر قرشیؒ، مجد شیرازیؒ، قاسم بن قطلو بغاؒ، قطب مکیؒ اور ملا علی قاریؒ کا، نیز احناف وغیر احناف علماء کے احوال میں لکھی جانے والی ملی جلی کتابوں کے مصنفین جلال الدین سیوطیؒ، حافظ ذہبیؒ، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، سخاویؒ، یافعیؒ اور محمد بن فضل المحبیؒ کا حوالہ دینے کے بعد مولانا عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانے کے علماء کی طرف سے معذرت بھی کی ہے کہ چونکہ مذکورہ مصنفین کی تصانیف ہمارے ملک (اکثر شہروں) میں مفقود ہیں اور پوشیدگی کے پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہیں۔(۷)

اس لیے ضرورت تھی کہ جن علماء کو ان مفقود و مخفی تصانیف تک رسائی حاصل ہوگئی ہے، وہ نہ صرف یہ کہ خود ان سے کام لیں، بلکہ ان سے حاصل کردہ معلومات کو منفعت عامہ کے لیے عام اور مشتہر بھی کریں۔ مولانا نے اس اہم خدمت کا بیڑا اُٹھالیا، اس لیے کہ انہوں نے اپنی ذاتی کوشش وکاوش سے مطبوعات کا ایک ایسا منتخب ذخیرہ فراہم کرلیا تھا کہ کسی علم وفن کی کوئی ضروری اور اہم کتاب مشکل سے ایسی ہوگی جو اُن کے کتب خانے میں نہ ہو، نادر مطبوعہ اور قلمی کتابوں سے ضروری معلومات کے اخذ کرلینے کا عجیب وغریب ملکہ بھی ان کو حاصل تھا، مفتی عبد الفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ انتہائی حیرت واستعجاب کے ساتھ کہتے ہیں:

''بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے- مولانا عبد الحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے- ہاتھ میں ایک ٹارچ ہے جس کی روشنی اَندھے خزانوں میں رکھی کتابوں کے اندرونی صفحات تک پہنچ کر ان کی سطروں کو منور کررہی ہے اور مخفی مطالب کو سامنے لے آرہی ہے۔''(۸)

مفتی عبد الفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ کی دو کتابوں ''**الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل**'' اور ''**الأجوبة الفاضلة للأمثلة العشرة الکاملة**'' کو ایڈٹ کرنے اور ان دونوں کتابوں میں درج اقتباسات کو اصل تصانیف سے نکالنے کے دوران اپنی مرعوبیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''میں حیرانی میں پڑ جاتا تھا اور سوچنے لگتا تھا کہ اس شیخ کو- مولانا عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ کو- کتابوں، وہ بھی بیشتر قلمی کتابوں کے صفحات پر بکھری ہوئی اپنے مطلب کی عبارتوں کو ڈھونڈھ نکالنے اور ان تک رسائی حاصل کرلینے کی کیسی عجیب وغریب قدرت حاصل تھی۔''(۹)

حواشی وحوالہ جات

۱:-مولانا عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت خود ان کی تصریحات کے مطابق ذوالقعدہ ۱۲۶۴ھ کی چھبیسویں کو سہ شنبہ کے روز مطابق ۲۴/اکتوبر ۱۸۴۸ء اتر پردیش کے شہر باندا علاقہ بندیل کھنڈ میں ہوئی، جہاں ان کے والد ماجد مولانا عبد الحلیم انصاری وفات ۱۲۸۵ھ-۱۸۶۸ء نواب باندا ذوالفقار الدولہ کے عہد میں مدرسۂ نواب میں مدرس تھے۔ مولانا کی تاریخ وفات ۳۰/ربیع الاول ۱۳۰۴ھ شب دوشنبہ مطابق ۲۷/دسمبر ۱۸۸۶ء ہے۔ حوالے کے لیے ۱:...تذکرۂ علمائے فرنگی محل از مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی مرحوم، صفحہ:۱۳۱، ۲:...کنز البرکات از مولانا حفیظ اللہ اعظم گڑھی، صفحہ:۱۳۵ اور ۳:...حسرۃ الفحول از مولانا عبد الباقی فرنگی محلی، صفحہ:۱۴۔

۲:-دو ہی ایک کتابیں ان کی ایسی ہیں جو باوجود مکمل ہوجانے کے ان کے سامنے طبع نہ ہوسکیں، جیسے ظفر الامانی بشرح المختصر المنسوب الی الجرجانی جس کی تصنیف سے مولانا عبد الحیؒ ۱۲ صفر ۱۳۰۴ھ-۱۸۸۶ء کو فارغ ہوئے تھے اس کے ڈیڑھ ہی مہینے بعد ان کی وفات ہوگئی۔ ان تصانیف کا یہاں ذکر نہیں جو زیر تصنیف تھیں اور مکمل نہ ہوسکیں۔

۳:-''مقدمة الأجوبة الفاضلة'' از مفتی عبد الفتاح رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبد الحی لکھنوی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الأجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الكاملة'' کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے، اس سے قبل وہ مولانا کی ایک اور تصنیف ''الرفع والتكميل فى الجرح والتعديل'' کو اسی طرح ایڈٹ کر کے شائع کر چکے ہیں، مولانا کی تیسری تصنیف ''إقامة الحجة على أن الاكثار فى التعبد ليس ببدعة'' اس کے بعد یعنی ۱۹۶۶ء میں اسی طرح ایڈٹ کر کے انہوں نے شائع کر دی۔ مولانا کی چوتھی تصنیف ''تحفة الأخبار فى إحياء سنة سيد الأبرار'' کو اسی معیار سے ایڈٹ کر کے شائع کرنے کا اعلان ان کی طرف سے ہو چکا ہے۔

۴:-مقالات سلیمانی، حصہ دوم، شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڑھ۔

۵:-''الفوائد البهية فى تراجم الحنفية'' از مولانا عبد الحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ صفحہ:۸، تیسرا ایڈیشن، مطبوعہ: یوسفی پریس لکھنؤ ۱۸۹۵ء۔

۶:-أیضاً۔ ۷:-أیضاً۔

۸:-''مقدمة الأجوبة الفاضلة''، صفحہ ۱۵ مطبوعہ حلب (شام) ۱۹۶۴ء۔ ۹:-أیضاً۔

(جاری ہے)

حضرت مولانا عبدالرحیم بستویؒ استاد دارالعلوم دیوبند کی رحلت!

(۱۳۵۳-۱۴۳۶ھ = ۱۹۳۴-۲۰۱۵ء)

مولانا عبدالرؤف غزنوی

سابق استاذ: دارالعلوم دیوبند انڈیا، حال استاذ: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن

رواں پندرہویں صدی ہجری کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے احقر کو دارالعلوم دیوبند پہنچنے اور تعلیمی سال ۱۴۰۱ھ-۱۴۰۲ھ کو دورۂ حدیث میں داخلہ لینے کی سعادت سے نوازا۔ اُسی سال حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب بستوی رحمۃ اللہ علیہ کو- جو جنوبی ہند کے کسی مدرسہ میں صدرالمدرسین کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے تھے- دارالعلوم بلایا گیا اور پڑھانے کے لیے ان کو درجاتِ متوسطہ تک کی کتابیں دی گئیں۔ احقر چونکہ دورۂ حدیث کا طالبِ علم تھا، اس لیے حضرت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ سے پڑھنے کا موقع تو نہ مل سکا جس سے ان کے طرزِ تدریس، افہام وتفہیم اور مزاج کا براہِ راست اور فوری طور پر کچھ نہ کچھ اندازہ ہوجاتا، البتہ ان کی تشریف آوری کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک دفعہ (غالبًا شبِ جمعہ کو) طلبہ کے لیے ان کے اصلاحی بیان کا انتظام کیا گیا تھا، جس میں احقر بھی حاضر ہوگیا تھا، اور یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کی علمی اور اصلاحی باتیں سننے کی سعادت نصیب ہوئی۔

مولانا نے اپنے بیان میں دل نشین اور عام فہم انداز میں علمی اور اصلاحی باتیں بھی کہیں اور چند آیتوں کی تفسیر کرتے ہوئے باریکیاں بھی خوب بیان کیں۔ ان کے اس بیان سے اندازہ ہوا کہ وہ ایک کامیاب مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بامہارت ونکتہ رس اور افہام وتفہیم پر قدرت رکھنے والے مقرّر بھی ہیں، اور طلبہ کے ساتھ شفقت وہمدردی کا ولولہ بھی ان کے مزاج کا حصہ ہے۔

رفتہ رفتہ طلبہ میں ان کی صلاحیت اور بالخصوص فن تفسیر ومعقولات کے میدان میں ان کی مہارت، میدانِ خطابت میں ان کی ہنرمندی اور افہام وتفہیم پر ان کی مقدرت کا چرچہ ہونے لگا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ موصوف ایک کہنہ مشق مدرس اور کامیاب مقرّر ہیں اور دارالعلوم سے فراغت کے بعد مختلف مدارس میں تدریس کی ذمہ داری انجام دیتے رہے ہیں، اور فن خطابت میں خداداد مہارت کے ذریعہ

عامۃ المسلمین کی اصلاح بھی فرماتے رہے ہیں، اور بالخصوص جنوبی ہند میں ان کا ایک اچھا خاصا بڑا حلقۂ احباب ہے، لیکن انہوں نے اپنی مادرِ علمی کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ایک معمولی مشاہرہ پر اس کی خدمت کو ترجیح دی اور جنوبی ہند کو خیر باد کہا۔ ان تمام باتوں سے یہ امید پختہ ہوگئی کہ ان شاء اللہ! مولانا کے ورودِ مسعود سے مادرِ علمی کو فائدہ ہوگا۔

حضرت مولانا کی دس سالہ رفاقت اور قریب سے دیکھنے کے مواقع

دورۂ حدیث سے فارغ ہونے کے بعد اگلے تعلیمی سال ۱۴۰۲ھ-۱۴۰۳ھ کو احقر نے اپنی مادرِ علمی کے شعبۂ افتاء (تخصص فی الفقہ) میں داخلہ لیا، جس کا دورانیہ ایک سال تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ اگلے سال اپنے آبائی علاقہ جاکر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے دین کی خدمت کرنے اور اپنی مادرِ علمی کی آواز کو اپنے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کروں گا، بہ عبارتِ دیگر! شعبۂ افتاء (تخصص فی الفقہ) میں داخلہ سورۂ توبہ کی آیت نمبر:۱۲۲ کے اس جملہ پر عمل کرنے کی کوشش تھی ''لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ'' (تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کریں) اور اگلے سال کے لیے مذکورہ آیت کے دوسرے جملہ ''وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ'' (اور جب اپنے لوگوں کے پاس لوٹ کر آئیں تو ان کو آگاہ کریں) پر عمل کرنے کا ارادہ تھا، لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا! اور وہ یہ کہ چونکہ دور افتادہ پہاڑی علاقہ سے آنے والا ایک نادیدہ طالبِ علم صرف دو سال کے اندر دارالعلوم دیوبند کے علمی، عملی اور تربیتی میدان سے ایک معمولی مناسبت کے علاوہ کوئی خاطر خواہ استفادہ اور دیوبندیّت میں پختگی حاصل نہیں کرسکتا اور اگر غور کیا جائے تو مادرِ نَسبی بھی اگرچہ ''حولین کاملین'' (دو مکمل سال) کے بعد اپنے جگر گوشہ کو دودھ پلانا بند کردیتی ہے، تاہم اس کو اپنی گود سے جدا نہیں کرتی اور نہ ہی اس کی تربیت کو موقوف کردیتی ہے، بلکہ صحیح معنوں میں تو اس کے بعد ہی اس کی تربیت شروع ہوتی ہے، لہٰذا! قدرت نے یہی چاہا کہ یہ حقیر طالب علم ابھی اپنی مادرِ علمی کی گود سے جدا نہ ہو، بلکہ اپنے اساتذۂ کرام ومشائخ عظام کی زیر سرپرستی احاطۂ دارالعلوم میں تدریس کا سلسلہ شروع کردے جو درحقیقت سیکھنے اور تربیت حاصل کرنے کا ایک نیا راستہ ہوگا۔

قدرتِ ایزدی کے اسی فیصلہ کے مطابق سال ۱۴۰۳ھ کو مدرس کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں احقر کا تقرر ہوا اور ماہِ ربیع الاول ۱۴۰۳ھ کو تدریس کا آغاز بھی کردیا۔ دارالعلوم دیوبند کی مسجد (مسجدِ قدیم) میں امامت وخطابت کی ذمہ داری بھی دورۂ حدیث کے سال سے اپنے بڑوں کے حکم پر احقر انجام دے رہا تھا۔ تدریس وامامت وخطابت کا یہ سلسلہ تقریباً دس سال تک جاری رہا، اس دوران دارالعلوم کے اساتذۂ کرام ومشائخ عظام سے استفادہ کرنے، مسلکِ دارالعلوم کو سمجھنے، اساتذۂ کرام کی عاداتِ کریمہ اور خصالِ حمیدہ سے واقف ہونے اور ان کے آپس میں قائم خوشگوار ومخلصانہ تعلقات کو قریب سے دیکھنے اور مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم (طلبۂ عزیز) کے ساتھ ان کی بے پناہ شفقت اور ان کی تربیت

کے طریقۂ کار کو ملاحظہ کرنے کا ایک بابرکت موقع نصیب ہوا۔

دارالعلوم دیوبند کے دس سالہ زمانۂ تدریس میں احقر نے اپنے ذہن میں دارالعلوم کے احاطہ میں موجود اساتذۂ کرام کو ان کی عمر، علمی مراتب اور احقر کی ان سے وابستگی وتعلق کی نوعیت کے پیشِ نظر تین طبقات پر تقسیم کردیا تھا۔

پہلا طبقہ ان اساتذۂ کرام کا تھا جن کے سامنے احقر نے زانوئے ادب وشاگردی تہ کردیا تھا اور انہوں نے احقر کو پڑھایا تھا اور تربیت بھی فرمائی تھی، جیسے حضرت مرشدی واستاذی مفتی محمود حسن گنگوہی صاحب صدر مفتی قدس سرہ، حضرت الاستاذ مولانا معراج الحق صاحب صدر المدرسین رحمۃ اللہ علیہ، حضرت الاستاذ مولانا نصیر احمد خان صاحب شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ، حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری موجودہ شیخ الحدیث وصدر المدرسین دامت برکاتہم، حضرت الأستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری استاد حدیث وسابق ناظم تعلیمات زیدمجدہم اور حضرت الاستاذ مولانا قمر الدین احمد صاحب گورکھپوری استاد حدیث مدظلہم۔ ان حضرات کے ساتھ احقر کا تعلق نیازمندانہ رہا اور ان کی تعظیم واحترام اپنی سعادت وکامیابی کا اہم ذریعہ سمجھتا رہا اور ان سے استفادہ تدریس کے زمانہ میں بھی جاری رہا، بلکہ ان میں سے جو بقیدِ حیات ہیں (اللہ تعالیٰ ان کی زندگیوں میں برکت عطا فرمائے) ان سے آج تک بذریعۂ فون یا خط وکتابت مسلسل رابطہ اور استفادہ کا سلسلہ قائم ہے، **وللّٰہ الحمد**۔

دوسرا طبقہ ان اساتذۂ کرام کا تھا جن سے احقر کو پڑھنے کی سعادت تو میسر نہیں ہوسکی تھی، البتہ علمی مقام میں ان کی برتری، استعداد وصلاحیت میں فوقیت اور عمر وتجربہ میں ان کی سبقت کی بنیاد پر احقر اُن کو بھی اپنے اساتذہ کا درجہ دیتا تھا اور ان کے ساتھ ادب واحترام سے پیش آنا اور ان کی صلاحیتوں اور تجربات سے فائدہ اٹھانا اپنے لیے سعادت سمجھتا تھا۔ اس طبقہ میں حضرت مولانا وحید الزمان صاحب کیرانویؒ، حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہم، حضرت مولانا عبد الحق صاحب اعظمی مدظلہم اور حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی مدظلہم جیسے حضرات تھے۔

تیسرا طبقہ ان حضراتِ اساتذہ کا تھا جو تقریباً میرے ہم عمر یا کچھ ہی بڑے تھے اور دارالعلوم میں ہم سب کی تقرریاں ایک ہی ساتھ یا کچھ آگے پیچھے ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ احقر کا تعلق دوستانہ اور بے تکلفانہ تھا، چنانچہ فارغ اوقات میں ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں اور دعوتوں کا تبادلہ بھی، کبھی عصر کے بعد چہل قدمی کے لیے ایک ہی ساتھ نکلنے کا سلسلہ بھی رہتا اور تہذیب کے دائرہ میں رہتے ہوئے ظرافت وخوش طبعی، ہنسی مذاق اور ساتھ ساتھ علمی مباحثہ کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ اس طبقہ میں برادرمکرم جناب مولانا عبد الخالق صاحب سنبھلی موجودہ نائب مہتمم، جناب مولانا محمد نسیم صاحب بارہ بنکوی، جناب مولانا شوکت علی صاحب بستوی جیسے دوست واحباب تھے۔

حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب بستوی قدس سرہ اپنی عمر وتجربہ کی سبقت اور استعداد و

صلاحیت کی برتری کی بنیاد پر ہماری نظروں میں مذکورہ بالا دوسرے طبقہ کے اساتذۂ کرام میں شامل اور قابلِ احترام تھے، لیکن ان کی تواضع وخوش اخلاقی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ ایک مخلص اور بے تکلف دوست جیسا معاملہ رکھا اور ہمارے اس تیسرے طبقہ کے ایک رکن رکین بلکہ فردِ کامل بن گئے اور ہماری ملاقاتوں، دعوتوں، پرلطف مجالس اور علمی مذاکروں میں مرکزی کردار ان ہی کا رہا اور ان کی موجودگی میں ہماری مجلسیں امام ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کردہ مرسَل حدیث ''روّحوا القلوب ساعةً وساعةً'' (رواہ ابوداود فی المراسیل رقم الحدیث:۴۴) یعنی ''اپنے قلوب کو گھڑی گھڑی راحت پہنچاؤ'' پر عمل کرنے کا بہترین منظر پیش کررہی ہوتی تھیں۔ یہ سلسلہ تقریباً دس سال تک جاری رہا، اس دوران احقر نے حضرت مولانا عبدالرحیم بستوی رحمۃ اللہ علیہ کے جن امتیازی اوصاف کا قریب ہی سے مشاہدہ کیا، ان میں سے چند اوصاف اختصار کے ساتھ درج کیے جارہے ہیں:

خوش اخلاقی وخندہ روئی

حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب بستویؒ ایک انسیّت شعار، خوش اخلاق اور مانوس کر لینے والے عالم دین تھے، وہ ہر ملنے والے شخص کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے اور کسی پر اپنا علمی رعب جمانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بڑوں، چھوٹوں اور ہم عصروں سب کی نظروں میں یکساں مقبولیت، بلکہ محبوبیت کے حامل تھے۔ مولانا کے ساتھ دس سالہ رفاقت کے دوران مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی اپنے قول یا فعل سے کسی کو کوئی دکھ یا گزند پہنچایا ہو، یا کسی کو شکایت کا موقع دیا ہو۔ امید ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ ذیل ارشاد کے مطابق انہوں نے اپنے نیک اخلاق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی بلند مقام حاصل کرلیا ہوگا:

''عن عائشةؓ قالت سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول إن المؤمن لیدرک بحسن خلقه درجة قائم اللیل وصائم النهار''۔ (رواہ ابوداود)

ترجمہ: ''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمارہے تھے کہ صاحبِ ایمان شخص اپنے اچھے اخلاق کے سبب ان لوگوں کا درجہ حاصل کرلیتا ہے جو رات بھر نفل نمازیں پڑھتے ہوں اور دن کو ہمیشہ روزے رکھتے ہوں''۔

خیرخواہی وہمدردی

مولانا بستوی صاحبؒ کے امتیازی اوصاف میں سے ایک وصف خیرخواہی وہمدردی کا بھی تھا۔ وہ امت مسلمہ کے ہر فرد اور بالخصوص اپنے جاننے والوں اور ملنے والوں کے لیے اپنے دل میں للّٰہی محبت، مخلصانہ ہمدردی اور سچی خیرخواہی کا جذبہ رکھتے تھے اور اپنے معاصرین کی ترقی وخوشحالی سے انہیں بڑی خوشی ہوتی تھی اور ان کو مبارکباد ودعاؤں سے نوازتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مولانا کے قلب میں

اُس باطنی بیماری کا کوئی خانہ نہیں، جس کے اثرات سے عوام کو تو چھوڑ یئے خواص بھی بہ مشکل بچتے ہیں اور وہ بیماری خطرناک اس حد تک ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق انسان کے نیک اعمال کو تباہ و غارت کر دیتی ہے۔ اور اُس کا ایک دوسرا خطرناک پہلو یہ بھی ہے کہ چونکہ وہ چھپی ہوئی ہوتی ہے، اس لیے اس میں مبتلا شخص کی اصلاح بھی مشکل ہوتی ہے اور وہ جرأت کے ساتھ اس بیماری سے لاتعلقی کا اعلان کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا رویہ، اس کے چہرے کی علامات اور اس کا طرزِ عمل اس پوشیدہ بیماری کی موجودگی کی خبر دیتا ہو۔ مولانا بستوی صاحبؒ نے اللہ کی توفیق سے اس بیماری سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا تھا اور وہ اپنی نیکیوں کو اس کے حوالہ کرنے کے ہرگز روادار نہ تھے۔ اس باطنی بیماری کا نام حسد ہے، جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بچنے کی تاکید فرمائی ہے، مندرجہ ذیل حدیث ملاحظہ ہو:

’’عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إياكم والحسد فإن الحسد يأكل الحسنات كما تأكل النار الحطب‘‘۔ (رواہ ابوداود)

ترجمہ:...... ’’حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم حسد سے بچو، اس لیے کہ حسد انسان کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑی کو کھا جاتی ہے‘‘۔

سخاوت و مہمان نوازی

حضرت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ کے بلند اوصاف میں سے ایک وصف سخاوت و فیاضی کا بھی تھا۔ وہ کھلے دل سے اپنے دوست واحباب، عزیز طلبہ اور ملنے والوں پر خرچ کرتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی معمولی مگر بابرکت تنخواہ جب ان کو ملتی تو دوستوں کو جلیبیاں وغیرہ کھلائے بغیر انہیں چین نہیں آتا تھا۔ ان کا کمرہ نمبر ۱۱۶ جو مدنی گیٹ سے متصل جانب مشرق میں دارِ جدید کی دوسری منزل پر واقع تھا، دوست واحباب کی ملاقاتوں، دعوتوں اور پرلطف مجالس کا مرکز تھا۔ مولانا نے اپنی سخاوت و فیاضی اور خوش اخلاقی و شیریں کلامی کی وجہ سے ہر ملنے والے کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور ہر شخص ان سے محبت کرتا تھا، اور امید یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل حدیث کے مطابق ان کو اللہ تعالیٰ اور جنت کا قرب بھی حاصل ہوگا اور دوزخ سے نجات و دوری نصیب ہوگی:

’’عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: السخيُّ قريب من الله، قريب من الجنة، قريب من الناس، بعيد من النار والبخيل بعيد من الله، بعيد من الجنة، بعيد من الناس، قريب من النار، والجاهل السخيُّ أحب إلى الله من عابد بخيل‘‘۔ (رواہ الترمذی)

ترجمہ:...... ’’حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سخی بندہ اللہ سے قریب ہے، جنت سے قریب ہے، لوگوں سے قریب ہے (یعنی لوگ اس سے محبت کرتے ہیں)، دوزخ سے دور ہے (یعنی دوزخ سے نجات نصیب ہوگی) اور کنجوس آدمی اللہ سے

دور ہے، جنت سے دور ہے (یعنی جنت اس کو نصیب نہیں ہوگی) لوگوں سے دور ہے (یعنی لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں)، دوزخ سے قریب ہے اور بلاشبہ بے علم سخی بندہ اللہ تعالیٰ کو عبادت گزار کنجوس شخص سے زیادہ پیارا ہوتا ہے''۔

متعلقین کی خبر گیری اور تعلقات کو نباہنا

مولانا بستوی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ تعلقات کو ایک محدود وقت یا مخصوص مقصد کے حصول تک قائم رکھنے کے ہرگز قائل نہ تھے۔ وہ تعلقات کو نبھانے اور انجام تک پہنچا دینے کے پاسدار تھے۔ محبت سے متعلق ان کی خواہش یہ رہتی تھی کہ محبت لِلّٰہ فی اللہ ہونی چاہیے اور قیامت کی اس گھڑی تک قائم رہنی چاہیے، جب اللہ تعالیٰ پکاریں گے کہ: ''**أین المتحابُّون بجلالي الیوم أظلهم في ظلي یوم لا ظل إلا ظلي**'' (رواہ مسلم) یعنی ''کہاں ہیں میرے وہ بندے جو میری عظمت وجلال کی وجہ سے آپس میں الفت ومحبت رکھتے تھے؟ آج جب کہ میرے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہیں ہے، میں اپنے ان بندوں کو اپنے سایہ میں جگہ دوں گا''۔

متعلقین کی خبر گیری اور ان کے ساتھ اچھے تعلقات برقرار رکھنا ایمان کی نشانی ہے۔ ابوعبداللہ حاکمؒ نے ''مستدرک'' میں صحیح سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ کی روایت سے ایک حدیث نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''ایک عمر رسیدہ خاتون نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت ہی اہتمام کے ساتھ اس کی خیریت دریافت فرمائی اور حالات معلوم کیے، جب وہ چلی گئی تو میں (حضرت عائشہؓ) نے عرض کیا، یارسول اللہ! آپ نے اتنے اہتمام کے ساتھ اس بڑھیا خاتون کی مزاج پرسی کیوں فرمائی؟ آپ نے فرمایا کہ یہ خدیجہؓ کے زمانہ میں ملنے آیا کرتی تھی اور تعلقات کی اچھی حفاظت کرنا ایمان کی علامت ہے۔'' (المستدرک- کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۴۰)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب ''صحیح البخاری ۲/ ۸۸۸'' میں کتاب الادب کے اندر باب نمبر۲۳ بہ عنوان ''**باب حسن العهد من الإیمان**'' (تعلقات کی اچھی طرح پاسداری کرنا ایمان کی علامت ہے) قائم کرکے مذکورہ بالا حدیث کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور باب کے نیچے ایک اور حدیث ذکر کی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے حضرت خدیجہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوست خواتین کی خبر گیری اور ان کے پاس ہدایا بھیجنے کا تذکرہ ہے۔

بہرکیف! مذکورہ بالا چار اوصاف وہ عناصرِ اربعہ تھے جن کی ترکیب سے حضرت مولانا عبد الرحیم بستوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کو مقبولیت، محبوبیت، جاذبیت اور عظمت حاصل ہوگئی تھی اور آج ان کا ہر جاننے والا دل کی گہرائیوں سے ان کے لیے دعا گو ہے اور ان کے فراق سے غمگین۔ ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی مستعار زندگی میں ایسا طرز اختیار کریں کہ اللہ تعالیٰ بھی ان سے راضی رہے اور

www.banuri.edu.pk

اللہ کے بندے بھی دعا گو رہیں اور آخرت میں نجات نصیب ہو۔

احاطۂ دارالعلوم سے جدائی کے بعد احقر کے ان سے روابط اور ان کے چند خطوط احقر کے نام

سال ۱۴۱۲ھ کو احقر کے والد ماجد کا پشین صوبہ بلوچستان میں انتقال ہوا، جس کے بعد والدہ محترمہ نے مجھے حکم دیا کہ اب تمہیں اپنی والدہ، بھائیوں اور بہنوں کی دیکھ بھال کے لیے مستقل طور پر پاکستان میں قیام کرنا چاہیئے۔ میرے لیے نہ تو مادرِ نسبی کے حکم سے روگردانی کا کوئی راستہ تھا اور نہ ہی ایک دم مادرِ علمی سے تعلقِ تدریس ختم کرنا آسان تھا، اس لیے میں نے دارالعلوم دیوبند سے تحریری طور پر ایک طویل رخصت کی درخواست کی اور والدِ ماجد کے سانحۂ وفات سے بھی آگاہ کر دیا، اس موقع پر ایک تحریر اپنے دوست جناب مولانا عبدالخالق سنبھلی صاحب کے نام بھی ارسال کردی، جس میں مولانا عبدالرحیم صاحب بستوی رحمۃ اللہ علیہ اور چند دیگر حضرات کی خدمت میں سلام پیش کرنے کی درخواست اور والد ماجد کے سانحۂ وفات کی اطلاع درج تھی، اس تحریر کے جواب میں مولانا بستوی صاحبؒ کی مندرجہ ذیل تحریر موصول ہوئی:

بحمد اللّٰہ تعالیٰ

صدیق مکرم حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب مُدَّ کرمُہٗ استاذ دارالعلوم دیوبند

سلام مسلسل، امید کہ آپ بہمہ زاویہ بعافیت ہوں گے، یہاں آپ کی کمپنی بھی بخیریت مصروفِ تدریس ہے، مکرمت نامہ بنام برادر مکرم حضرت مولانا عبدالخالق سنبھلی مدّ فیضہ استاد دارالعلوم دیوبند میرے مطالعہ میں بھی آیا، مندرجہ کوائف علم میں آئے، طویل رخصت کی وجہِ خاص سمجھ میں نہیں آئی، عیدالاضحیٰ کی تعطیل میں ہم لوگ اپنے اپنے وطن کے لیے پابہ رکاب ہیں، میری واپسی انشاء اللہ ۲۶ر جون کے بعد ہوگی، گھر پر کچھ مصروفیت ہوگی، اُدھر سے عمرہ کرتے ہوئے ۳راپریل کو دہلی واپس آ گیا تھا، اور ۵راپریل اتوار کو گھر پہنچا، پھر ۱۵راپریل کو دیوبند آ گیا، آپ کے والد ماجد کے انتقال پُر ملال کی خبر سے بڑا دکھ ہوا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور آپ حضرات کو اس عظیم سانحہ پر صبر جمیل دے، آمین۔ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کے والد ماجد بھی ۲۳ر مئی کو انتقال فرما گئے، إنا لِلّٰہ وإنا إلیہ راجعون، آپ ایک تعزیتی خط ضرور لکھ دیں۔

دیوبند میں شدید گرمی ہے، کسی پہلو چین نہیں، اُس جوتے کی ضرورت تو موسم سرما میں پڑے گی جب پاؤں میں خفَّین ہوں گے، خدا کرے آپ کو یاد رہے، حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم اور مولانا شفیق سلمہ بستوی کو بہت بہت سلام عرض ہے، اور اپنے بھائیوں کو بھی سلام یاد کہہ دیں۔

عبدالرحیم بستوی دارالعلوم دیوبند

6-6-92

مولانا نے اپنی تحریر میں جس جوتے کا ذکر فرمایا ہے وہ روسی ساخت کا ایک ہلکا مگر گرم جوتا ہوتا ہے جو سردیوں میں خفین کے ساتھ پہننے کے لیے موزوں ہوتا ہے، مولانا کو وہ جوتا پسند تھا، میں نے اپنی تحریر میں لکھ دیا تھا کہ اگر وہ دستیاب ہو جائے تو میں ان شاء اللہ بھیج دوں گا۔

مولانا سال ۱۹۸۷ء سے برابر رمضان المبارک کی تعطیل لندن میں مقیم مسلمانوں اور متعلقین کے اصرار وخواہش کے مطابق وہاں پر گزارتے تھے اور اپنے مؤثر بیانات ودرس قرآن کے ذریعہ لوگوں کی اصلاح فرماتے تھے، لندن کے مذکورہ اسفار میں بیان کیے گئے ان کے مواعظ ''خطباتِ لندن'' کے نام سے شائع ہوتے تھے اور دینی حلقوں میں خوب پسند کیے جاتے تھے، مولانا کی ذرہ نوازی تھی کہ لندن میں قیام کے دوران کبھی احقر کو فون کر کے خبر گیری فرماتے تھے اور کبھی تحریر کے ذریعہ اپنے خلوص وشفقت کا اظہار فرماتے۔ مندرجہ ذیل تحریر انہوں نے لندن کے سفر سے واپسی پر ہندوستان سے احقر کے نام ارسال کر دی تھی:

بحمد اللہ تعالیٰ

رفیق مکرم، صدیق محترم حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب افغانی دامت برکاتہم!

سلام مسلسل، امید کہ طرح دار مزاج بخیر ہوں گے، آپ کا پُر مزاح مکتوب نظر نواز ہوا، آپ کے زعفرانی جملے جب مجلسِ احباب میں پڑھ کر سنائے گئے تو پوری مجلس قہقہہ زار ہوگئی، لندن کے سفر سے جب میں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ آپ نے اپنے کمرہ میں جھاڑو پھیر دیا ہے تو اسی وقت گمان ہوا کہ بین السطور کچھ ہے، افسوس کہ مجلس کا ایک اہم رکن ہماری نظروں سے غائب ہوگیا، آپ کی یہ جدائی ہم پر شاق ہے، نوشتۂ تقدیر کو کیا کہا جائے، آپ کی وہ شیریں اور دل آویز گفتگو اب کہاں سے سن سکیں گے، حضرت مولانا عبد الخالق صاحب سنبھلی، حضرت مولانا نسیم احمد صاحب بارہ بنکوی اور حضرت مولانا شوکت علی صاحب بستوی آپ کے انتقالِ مکانی کو بری طرح محسوس کررہے ہیں، ویسے وہاں آپ کو یقیناً سکون رہے گا، وطن سے قریب اور یافت بھی اچھی۔ بھائیوں کے بارے میں معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کہاں اور کیا خدمت کررہے ہیں۔ عیدالاضحیٰ کی تعطیل میں گھر گیا تھا، ۲۷رجون کو دیوبند واپس آیا، واپسی کے بعد دو ہفتہ علیل رہا، اب دو دن سے پھر بخار نے حملہ کر دیا ہے، بخار کی حالت میں ہی یہ خط لکھ رہا ہوں، عزیزم شفیق بستوی سلمہ اچانک دیوبند آگئے، سوچا کہ موقع اچھا ہے، کیوں نہ چند سطریں آپ کی خدمت میں پیش کردی جائیں، سارے ''ہُدی'' آپ کو سلام کہتے ہیں۔

حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب قاسمی سلامِ یاد عرض کرتے ہیں۔

عبدالرحیم بستوی دارالعلوم دیوبند

28-7-92

مذکورہ بالا تحریر میں مولانا نے جو جملہ لکھا ہے ''سارے ہُدیٰ آپ کو سلام کہتے ہیں'' اس سے مراد اُن کے ۹ رصاحبزادے ہیں جن میں سے ہر ایک کے نام کے آخر میں ''ہُدیٰ'' لفظ ہے جیسے ''نور الہدیٰ''، وغیرہ۔ اگلے سال مولانا بستوی صاحبؒ نے لندن ہی سے مندرجہ ذیل تحریر ارسال کر دی تھی:

بحمد اللّٰہ تعالیٰ

رفیق مکرم، صدیق لئیق حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب افغانی استاد دارالعلوم دیو بند قبل ستۃ واحدۃ۔

سلام مسلسل، امید کہ آپ بہمہ زاویہ بخیر ہوں گے، میں یہ خط لندن سے لکھ رہا ہوں، ۲۲ رفروری دوشنبہ کو یہاں پہنچا۔ عید کے بعد ۲۷ رمارچ شنبہ کو ان شاء اللہ دہلی کے لیے واپسی ہوگی۔ رمضان میں یہاں مشغلہ تفسیر قرآن اور بیان ہے۔ مولانا ریاست علی صاحب اور مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری بھی تشریف لائے ہیں، مگر یہ دونوں حضرات لندن سے دور دوسرے شہر میں ہیں، مولانا مفتی عبدالرزاق صاحب بھوپالی بھی آئے ہیں اور لندن ہی کی ایک مسجد میں قرآن کریم کی تفسیر کر رہے ہیں۔ میں دہلی سے ان شاء اللہ! سیدھے گھر جاؤں گا، ۱۱/شوال کو ان شاء اللہ پھر دیو بند پہنچوں گا، آپ کو خط لکھنے میں تاخیر ہوگئی، اس تاخیر پر معذرت خواہ ہوں، مجھے کسی نے اطلاع دی ہے کہ عزیزم مولانا شفیق احمد بستوی عمرہ کے لیے گئے ہیں، ہوسکتا ہے آپ بھی تشریف لے گئے ہوں، یہ خط جب بھی نظر سے گزرے اور شفیق سلمہ ہوں تو میرا اسلام یاد کہہ دیں۔ میرے ایک جگری دوست الحاج اظہار افسر صاحب بنگلور سے کراچی پہنچے ہوں، ہوسکتا ہے آپ سے ملاقات ہو، ان کے خط میں آپ کو سلام لکھا تھا، ملاقات پر ان کو بتا دیں کہ میں ۲۷ رمارچ کو لندن سے ان شاء اللہ دہلی واپس ہوں گا، کبھی کبھی آپ کی یاد بہت ستاتی ہے، اب تو بظاہر ملاقات کی صورت بھی نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ دعا کیجئے! کسی بہانے اللہ تعالیٰ مجھے ہی کراچی پہنچا دے، مجلس احباب میں آپ کی یاد رہتی ہے، مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی ۱۰ ررمضان تک دارالعلوم میں رہے ہوں گے، اس کے بعد گھر چلے گئے ہوں گے۔ مولانا محمد نسیم صاحب رمضان سے پہلے ہی بچوں کو لے کر گھر جا چکے تھے، قاری جمشید صاحب مدراس گئے ہیں اور قاری عبدالرؤف صاحب رمضان میں کہیں نہیں گئے، والسلام

عبدالرحیم بستوی، لندن

15-3-93

مولانا سے احقر کی آخری ملاقات

ماہِ رجب ۱۴۳۵ھ کو ۲۳ رسالہ جدائی کے بعد اللہ تعالیٰ نے احقر کو ایک مرتبہ پھر اپنی مادرِ علمی کی زیارت کا موقع عنایت فرمایا، اس موقع پر حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب بستویؒ سے ان کی اقامت گاہ پر جو ''دارالمدرسین'' میں واقع تھی ملاقات ہوگئی اور پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ مولانا نے حسبِ معمول

شفقت واکرام کا معاملہ فرمایا اور ساتھ ساتھ ایک ہزار روپے کا مخلصانہ ومشفقانہ ہدیہ بھی پیش فرمایا، اور مزید ایک ہزار روپے میرے توسط سے مولانا شفیق احمد صاحب بستوی ناظم واستاد حدیث جامعہ خدیجۃ الکبریٰ کراچی کے لیے ہدیہ کے طور پر ارسال کردیئے، یہ کس کو معلوم تھا کہ اس دارِ فانی کے اندر مولانا بستوی صاحبؒ سے یہ میری آخری ملاقات ثابت ہوگی!؟ مجھے قوی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں گے اور مولانا اپنے مخلصانہ اور مشفقانہ مزاج کے مطابق وہاں پر بھی ہم جیسے قصوروار دوستوں کو فراموش نہیں کریں گے اور ہمارا سہارا بنیں گے۔

مولانا کے لائق وفائق اساتذۂ کرام

مولانا بستوی صاحبؒ نے دار العلوم دیوبند میں سال ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء داخلہ لیا اور چار سال دارالعلوم میں رہ کر سال ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۹۵۶ء دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، حضرت مولانا سید فخر الحسن صاحب مرادآبادیؒ، حضرت مولانا بشیر احمد خان صاحب بلندشہریؒ، حضرت مولانا ظہور احمد صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا محمد جلیل صاحب کیرانویؒ اور حضرت مولانا سید حسن صاحب دیوبندی (قدس اللہ اسرارہم) ان کے دورۂ حدیث کے اساتذہ تھے۔ واضح رہے: شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ کے شاگردوں میں سے دارالعلوم دیوبند کے اندر اب چند ہی حضرات بقیدِ حیات رہ گئے ہیں۔

مولانا بستوی صاحبؒ کا شمار زمانۂ طالب علمی میں بھی ممتاز وفائق طلبہ میں ہوتا تھا، ان کے ہم وطن وہم سبق حضرت مولانا صادق علی صاحب قاسمی ''خطباتِ لندن'' کے ''پیش لفظ'' کے تحت بستوی صاحبؒ کے زمانۂ طالب علمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن مغرب کے بعد احاطۂ دارِ جدید میں مولانا قطبی تصدیقات کا تکرار کرا رہے تھے، تقریباً ڈیڑھ دوسو طلبہ کا ایک جم غفیر تکرار میں شریک تھا، سبھی گوش برآواز، مجلسِ تکرار میں سناٹا، مولانا کے سامنے کوئی کتاب بھی نہیں ''لڑتے ہیں مگر ہاتھ میں تلوار بھی نہیں'' کا سراپا، تقریر جاری ہے، ضلع اعظم گڑھ کی مشہور وقدیم درسگاہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا عبد الباری صاحب جواب مرحوم ہوچکے ہیں کسی ضرورت سے دارالعلوم تشریف لائے تھے، ادھر سے گزر رہے تھے، طلبہ کے اس جم غفیر کو دیکھ کر رُک گئے، کوئی استاد یہاں میدان میں درس دے رہا ہے کیا؟ ان طلبہ سے پوچھا جوان کے ہم وطن ان کے ہمراہ تھے، کہا: نہیں! بستی کا ایک طالب علم ہے عبدالرحیم، تکرار کرا رہا ہے، فرمایا! اچھا! اتنے طلبہ تکرار میں؟ وہ کھڑے ہوکر سننے لگے، بہت خوش ہوئے اور بڑھ کر دو روپیہ انعام دیا، دو روپیہ اس زمانہ میں کچھ کم نہیں تھا، اگرچہ انعام کی مٹی بھی بڑی چیز اور یادگار ہوتی ہے''۔

مولانا کا سفرِ آخرت، نماز جنازہ اور مزارِ قاسمی میں تدفین

مولانا نے ضعف ونقاہت کے باوجود تعلیمی سال ۱۴۳۵-۱۴۳۶ھ کے آخر تک پڑھایا اور ماہِ شعبان امتحانِ سالانہ کی تکمیل کے بعد زمانۂ تعطیل میں بیماری اور کمزوری بتدریج بڑھتی گئی اور علاج کا سلسلہ بھی رہا، مگر کوئی خاطر خواہ افاقہ نہ ہوا اور بیماری مایوس کن حد تک پہنچ گئی، مجھے برادر مکرم جناب مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی استاد ونائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ان کی مذکورہ کیفیت کی اطلاع بذریعۂ فون کردی تھی۔ متعلقین سب ان کی صحت وعافیت کے لیے دعائیں کرتے رہے، یہاں تک کہ وقتِ موعود آپہنچا اور انہوں نے قمری حساب سے تقریباً تراسی سال اور شمسی حساب سے تقریباً اکیاسی سال کی عمر میں ۲۴/ ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۹/ستمبر ۲۰۱۵ء بروز بدھ تقریباً نو بجے صبح داعی اجل کو لبیک کہا! إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔ ان کی نماز جنازہ احاطۂ دارالعلوم دیوبند میں حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری دامت برکاتہم استاد حدیث وسابق ناظمِ تعلیمات کی امامت میں ادا کی گئی جس میں علماء کرام، طلبۂ عزیز، مولانا کے دیگر متعلقین وشہری حضرات نے بڑی تعداد میں شرکت کی، نماز جنازہ کے بعد مولانا کی نعش کو مزارِ قاسمی میں سپرد خاک کیا گیا، جہاں بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ سمیت بڑے بڑے اکابرین واہل اللہ آسودۂ خواب ہیں۔ مولانا کی مغفرت ورفعِ درجات کے لیے دارالعلوم دیوبند اور ملک کے دیگر حصوں میں بلکہ بیرونِ ملک بھی متعلقین کی جانب سے ایصال ثواب ودعاؤں کا اہتمام کیا گیا اور ان شاء اللہ! دعاؤں کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

انہوں نے اپنے پیچھے اپنی اہلیہ محترمہ، اور لائق وفائق نو صاحبزادوں اور ایک صاحبزادی سمیت شاگردوں اور متعلقین کی ایک بڑی تعداد کو سوگوار چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائیں اور پس ماندگان ومتعلقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

حضرت مولانا اکرام اللہ خان صاحب کو دلی صدمہ

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے استاذ وناظمِ دفتر حضرت مولانا اکرام اللہ خان صاحب کی صاحبزادی بشائر (عمر تقریباً تین سال) چند دن علیل رہنے کے بعد ۱۹ ربیع الاول، مطابق ۳۱ دسمبر ۲۰۱۵ء کو اُنہیں داغِ مفارقت دے گئی۔ جامعہ کے رئیس حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر دامت برکاتہم العالیہ نے اُن کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور ڈالمیا قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

قارئین ''بینات'' سے درخواست ہے کہ وہ دعا کریں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت مولانا اکرام اللہ خان صاحب، ان کی اہلیہ اور لواحقین کو یہ دلی صدمہ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس بچی کو اُن کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔

آؤٹ سورسنگ (خدمات فراہم کرنے والے) ادارے

کی اجرت اور ابتداءً فارمولا طے کرنا!

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

فی زمانہ ''Out sourcing'' کا ایک طریقہ کاروباری اداروں میں رائج ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کمپنی اپنے کام کروانے کے لیے خود ملازمین رکھنے کے بجائے کسی دوسرے ''ادارے'' کو اپنا کام سپرد کردیتی ہے اور وہ ادارہ کمپنی کے کاموں کے لیے اپنے پاس سے کمپنی کے مطلوبہ معیار کے مطابق افراد مہیا کرتا ہے جو اس ادارے کے ملازمین ہوتے ہیں، لیکن وہ اس کمپنی کی ہدایات کے مطابق کام کرتے اور کمپنی کو اپنی خدمات فراہم کرتے ہیں۔ کسی کمپنی کو اپنے ہاں کسی سروس یا خدمت کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ کمپنی ''Out sourcing'' کا کام کرنے والے کسی ادارے سے معاہدہ کرتی ہے۔ کمپنی اپنے کام کے لیے مطلوبہ افراد کی تعداد بتاتی ہے اور ادارہ کمپنی کی ضرورت کے مطابق مارکیٹ میں مطلوبہ مہارت کے حامل افراد تلاش کرکے ان افراد کی اجرت بتاتا ہے، اس طرح کمپنی اور ادارے کی باہمی رضامندی سے افراد کی تعداد اور ان کی اجرت طے پاتی ہے۔ اب یہ افراد کمپنی کا مطلوبہ کام کرتے ہیں، چونکہ یہ لوگ ہر لحاظ سے اسی ادارے کے ملازم ہوتے ہیں، اس لیے انہیں تنخواہیں اسی ادارے کی طرف سے ملتی ہیں، جبکہ کمپنی ادارے کو اس کی اجرت دیتی ہے جو ادارے کے خرچے سے کچھ زیادہ ہوتی ہے، اس طرح اس ادارے کو اپنی خدمات کا معاوضہ مل جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں کمپنی جس طرح عموماً براہ راست مختلف افراد کو Hire کرکے ان سے کام لیتی ہے اور وہ ملازمین کمپنی کے معیار کے مطابق کام کرنے کے پابند ہوتے ہیں، اسی طرح ''Out sourcing'' والا ادارہ کمپنی کے کام کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے، جو کہ وہ اپنے ملازمین سے کراتا ہے اور ان کو اجرتیں دیتا ہے اور خود اپنی ان خدمات کے بدلے میں کمپنی سے ایک طے شدہ فارمولے کے مطابق اجرت وصول کرتا ہے۔

کمپنی اور اس ادارے کے درمیان اجرت کا فارمولا کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ معاہدے کے وقت ہی باہمی رضامندی سے یہ طے کرلیا جاتا ہے کہ ادارہ کمپنی کے فلاں فلاں کام اپنے ملازمین کے ذریعے کرائے گا اور وہ ملازمین اس معیار کے ہوں گے اور ان کی تنخواہیں اتنی حد تک ہوں گی، مثلاً یہ طے ہوگیا کہ ڈرائیور کی تنخواہ ۱۳ تا ۱۵، اسٹور کیپر کی ۱۰ تا ۱۲ اور لوڈر کی ۸ تا ۱۰ ہزار ہوسکتی ہے اور یہ ملازمین کمپنی کی طلب

اورکام کے پھیلاؤ کے مطابق کبھی کم یا زیادہ ہوتے رہتے ہیں۔

اب کمپنی اورادارہ آپس میں یہ طے کرتے ہیں کہ کمپنی کے کاموں میں ادارے کے جتنے ملازمین لگے ہوئے ہوں گے ان کی کل ماہانہ تنخواہ پر ایک مقررہ فیصد اضافہ کرکے جو رقم بنے گی وہ اس ادارے کی اجرت ہوگی، مثلاً یہ حصہ اگر 10% طے ہوا اور جنوری میں ان ملازمین کی کل تنخواہیں ایک لاکھ روپے بنیں تو وہ ادارہ کمپنی سے ایک لاکھ دس ہزار روپے وصول کرے گا اور یہ اس کی ماہ جنوری کی اجرت ہوگی اور فروری میں اگر ملازمین بڑھ گئے اور ان کی تنخواہیں دولاکھ روپے بنیں تو ادارہ کمپنی سے دولاکھ بیس ہزار روپے وصول کرے گا۔اسی طرح کمی کی صورت میں اس کے برعکس ہوگا۔

واضح رہے کہ معاہدے کے وقت ادارہ کی ایک متعین اجرت اس لیے طے نہیں کی جاسکتی کہ کمپنی کے کاروبار میں کمی، زیادتی اور ملازمین کے گھٹانے، بڑھانے کا عمل کام کی ضرورت کے لحاظ سے مسلسل جاری رہتا ہے،لہٰذا کمپنی اورادارے میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ مستقبل کے بارے میں اندازے کی بنیاد پر کوئی متعین اجرت طے کی جائے، بلکہ دونوں ایک فارمولا طے کرلیتے ہیں، تاکہ ان کا یہ معاہدہ اگر کئی سال تک بھی جاری رہے تو اس میں کوئی پریشانی نہ ہو اور تمام کام بحسن وخوبی انجام پاتے رہیں۔اس میں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ملازمین کی تعداد اور ان کی تنخواہوں کے بارے میں کمپنی بالکل لاعلم نہیں ہوگی، بلکہ اسے پتہ ہوگا کہ ادارے کے کتنے ملازمین میرے یہاں کام کررہے ہیں، نیز کسی پرانے ملازم کی تبدیلی کے وقت یا کسی نئے ملازم کے اضافے کے وقت بھی ادارہ کمپنی کو آگاہ کرے گا، اور اگر کسی وقت ادارے کو کمپنی کی طرف سے طے شدہ تنخواہ کی حد کے اندر ملازم نہیں ملے گا تو وہ کمپنی کو اطلاع دے گا کہ ملازم مقررہ حد سے زیادہ پر مل رہا ہے، پس اگر کمپنی اس کو منظور کرے گی تو ادارہ اس کو رکھے گا، ورنہ نہیں، البتہ جو طے شدہ حد کے اندر اندر والے ملازمین ہوں گے ان میں سے ہر ایک کے بارے میں کمپنی سے پوچھا نہیں جائے گا، بلکہ صرف یہ اطلاع دی جائے گی کہ فلاں فلاں شخص آپ کے فلاں فلاں کام کے لیے رکھا گیا ہے۔

خدمات کی سہولت فراہم کرنے کا یہ طریقہ اور اس کی اجرت کو مذکورہ بالا حساب سے طے کرنا آج کل دنیا بھر میں رائج ہے، اس میں عام طور پر اجرت کے معاملے میں کوئی شرعی معاملہ نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں اجرت سے متعلق جو فارمولا طے کیا جاتا ہے، اس پر باہمی رضامندی سے عمل جاری رہتا ہے۔

اس صورتحال کی روشنی میں سوال یہ ہے کہ کیا ''Out sourcing'' والے ادارے کی اجرت کے حساب کے لیے مذکورہ فارمولا طے کرنا شرعاً جائز ہے؟ جبکہ اس میں ایک حد تک غرر کا شبہ معلوم ہوتا ہے کہ اجرت کی رقم جامد نہیں، بلکہ کم یا زیادہ ہوتی رہے گی، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔اور اگر یہ جائز نہ ہو تو اس کا جائز طریقہ کیا ہوگا؟

مستفتی: اظفر اقبال رشید

الجواب حامدًا ومصليًا

واضح رہے کہ ''آؤٹ سورسنگ فارمولے'' کے تحت خدمات فراہم کرنے والے ادارے کی اجرت طے کرنے میں اجرت کی پیشگی تعیین نہیں ہو رہی، جس کی وجہ سے یہ معاملہ ایک گونہ غرر سے خالی

نہیں۔ البتہ اگر ادارہ ملازمین کی تنخواہوں کا معاملہ ملازمین سے حتمی طور پر طے کر کے کمپنی میں کام کے لیے لگانے سے پہلے کمپنی کو اعتماد میں لے (مثلاً دس ہزار یا بارہ ہزار کا ابہام ختم کرے) تو پھر صرف دس فیصد کی اجرت کے ابہام کی وجہ سے یہ معاملہ ناجائز نہیں ہوگا، یہ طریقہ خدمات فراہم کرنے والے ادارے اور کمپنی کے لیے قابل قبول ہے اور عام طور پر دونوں کے درمیان کوئی نزاعی معاملہ نہیں ہوتا، اس لیے ادارے کی اجرت کے حساب کے لیے آؤٹ سورسنگ فارمولے کے تحت اجرت کی وصولی وادائیگی کی گنجائش ہے۔ جیسا کہ اعلاء السنن میں ہے:

’’وفی الحاوی: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لابأس به، وإن كان فی الأصل فاسداً، لكثرة التعامل وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه كدخول الحمام، قلت: والحاصل أن الجهالة اليسيرة عفو فی ماجری به التعامل، لكونها لاتفضی إلی النزاع عادة۔‘‘ (اعلاء السنن، ج:۱۶،ص:۲۰۹،، ط: ادارۃ القرآن)

الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ میں ہے:

’’ينقسم الغرر من حيث تأثيره علی العقد إلی غرر مؤثر فی العقد وغرر غير مؤثر، قال ابن رشد الحفيد: الفقهاء متفقون علی أن الغرر الكثير فی المبيعات لايجوز وأن القليل يجوز وقال النووی ؒ: نقل العلماء والإجماع فی أشياء غررها حقير: منها أن الأمة أجمعت علی صحة بيع الجبة المحشوة وأجمعوا علی جواز إجارة الدار وغيرها شهرا مع أنه قديكون ثلاثين يوماً وقد يكون تسعة وعشرين يوماً وأجمعوا علی جواز دخول الحمام بأجرة۔‘‘ (الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ، ج:۳۱،ص:۱۵۱،تحقیق لفظ غرر)

بدائع الصنائع میں ہے:

’’قال الصباغ: وإن صبغت هذا الثوب بعصفر فلک درهم وان صبغته بزعفران فلک درهمان فذلک جائز لأنه خير بين إيفاء منفعتين معلومتين فلاجهالة ولأن الأجر علی أصل أصحابنا لايجب إلا بالعمل وحين يأخذ فی أحد العملين تعين ذلک الأجر وهذا عند أصحابنا الثلاثة۔‘‘(ص:۱۸۵،ج:۴،ط:سعید)....’’وفيه أيضاً: وقولهما: الأجرة مجهولة لكن الجهالة لاتمنع صحة العقد بعينها بل لإفضائها إلی المنازعة وجهالة الأجرة فی هذا الباب لاتفضی إلی المنازعة لأن العادة جرت بالمسامحة مع الآظار والتوسع عليهن بالشفقة علی الأولاد‘‘۔ (بدائع الصنائع،ص:۱۹۴، کتاب الإجارۃ، ج:۴، ط: سعید)

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہٗ
ابوبکر سعید الرحمٰن	عبدالقادر	رفیق احمد بالاکوٹی

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن

www.banuri.edu.pk

ادارہ

خطباتِ مشاہیر (دس جلدیں)

حضرت مولانا سمیع الحق۔ صفحات: جلد اول: ۴۰۰، جلد دوم: ۵۷۲، جلد سوم: ۵۹۴، جلد چہارم: ۵۳۲، جلد پنجم: ۴۱۰، جلد ششم: ۵۰۴، جلد ہفتم: ۴۷۸، جلد ہشتم: ۴۷۸، جلد نہم: ۴۶۶، جلد دہم: ۵۰۲۔ قیمت: درج نہیں۔ پتہ: مکتبہ ایوانِ شریعت، جامعہ دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک، خیبر پختون خوا۔

حضرت مولانا سمیع الحق دامت برکاتہم العالیہ ہمارے اکابر اور بزرگانِ دین میں سے ان موفق من اللہ شخصیات میں سے ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اخلاف کو اسلاف کے ساتھ مربوط کرنے اور جوڑنے کا غیر معمولی ملکہ اور حظ وافر نصیب فرمایا ہے اور یہ صرف آپ کی خصوصیات میں سے ہے کہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ میں ہر آنے والے مکتوب کا مضمون اور ہر بیان کرنے والے مندوب کا بیان منظّم ومرتب ہوکر فائلوں میں محفوظ ومرقوم ہے، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان محفوظ مکتوبات کا مجموعہ مرتب ہوکر ''مکتوباتِ مشاہیر'' کے نام سے دس ضخیم جلدوں میں منصۂ شہود پر آکر اہلِ علم سے خوب خوب دادِ تحسین پاچکا ہے اور اب جامعہ دارالعلوم حقانیہ اور اس کی وساطت اور مناسبت سے کیے گئے خطابات کا مجموعہ ''خطباتِ مشاہیر'' کے عنوان سے پانچ ہزار ایک سو چالیس صفحات کی ضخامت لیے ہوئے دس جلدوں پر مشتمل زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر دنیائے علم وادب سالکین راہِ اصلاح وسلوک کے سامنے پیش ہورہا ہے۔ حضرت مولانا سمیع الحق دامت برکاتہم ''خطباتِ مشاہیر'' کی جلد اول کے مقدمہ میں اس کتاب کے تعارف کے بارہ میں رقم طراز ہیں:

> ''خطباتِ مشاہیر ایک ایسا گلدستہ اور کہکشاں علم وہدایت ہے، جس میں آپ علم وہدایت، رشد واصلاح، تصوف وسلوک، جہاد وسیاست، دعوت وتبلیغ، درس وتدریس کے اوجِ بلند پر فائز شخصیات کی صحبت واستفادہ کی بیک وقت سعادت حاصل کرسکتے ہیں، مثال کے طور پر مرشدین ومصلحین امت میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ التفسیر لاہوریؒ، مولانا عبدالغفور عباسی مدنیؒ، مولانا خواجہ عبدالمالک نقشبندیؒ، مولانا درخواستی

صاحبؒ اور حکماء اور دعاۃ امت میں حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ، داعی کبیر مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، محدثین ومحققین میں شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ، مولانا شمس الحق افغانی صاحبؒ، علامہ محمد یوسف بنوریؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، دعوت وتبلیغ میں مولانا محمد یوسف دہلویؒ، مولانا محمد طلحہ کاندھلوی اور مولانا طارق جمیل، درس وتدریس میں اساتذہ ومشائخ دارالعلوم دیوبند وجامعہ حقانیہ، جہاد وعزیمت کے میدانوں کے شہسوار مولانا یونس خالص، مولانا محمد نبی محمدی، مولانا جلال الدین حقانی، امیرالمؤمنین ملامحمد عمر مجاہدؒ، ضیاءالمشائخ ابراہیم جان شہیدؒ، صبغۃ اللہ مجددی، استاذ برہان الدین ربانی، ملامحمد ربانیؒ، زعماء جہاد میں خلعت شہادت سے سرفراز شیخ اسامہ بن لادن، چیچنیا کے شہید صدر زیلم خان جیسے بے شمار شہدائے جہاد شامل ہیں۔ میدانِ خطابت کے شناور شہنشاہ خطابت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، خطیب بے بدل مولانا احتشام الحق تھانویؒ، میدانِ حرب وضرب کے جنرل حمید گل، جنرل اسلم بیگ، آئین وقوانین کے ماہرین جناب اے کے بروہی، جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال، وہ زعماء جو دین اور سیاست کے میدانوں میں قائدانہ مقام رکھتے تھے، مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا عبدالستار نیازیؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور قاضی حسین احمدؒ، حافظ محمد سعید اور دیگر بے شمار قائدین اور خالص سیاسی زعماء میں خان عبدالغفار خان، عبدالولی خان، اجمل خٹک، میاں نواز شریف، وسیم سجاد، چوہدری ظہور الٰہی، ارباب غلام رحیم، غلام مصطفیٰ جتوئی، نوابزادہ نصر اللہ، راجہ ظفر الحق ودیگر اور ان کے علاوہ عالم عرب کے سرکردہ علماء ومشایخ علامہ بشیر الابراہیمی الجزائری، علامہ شیخ ابوغدہ، علامہ محمود صواف، علامہ عبدالمجید زندانی، مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز، ڈاکٹر عبداللہ المحسن ترکی، نائب رئیس الجامعہ مدینہ کے شیخ عبداللہ الزائد، جامع ازہر کے کئی شیوخ الازہر، امام حرم شیخ صالح بن حمید، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف جیسے درجنوں کے علوم وفیوض کی ایک جھلک ان خطبات کے ذریعہ دکھائی دے گی۔ مدارس عربیہ کے تعلیمی نظام ونصاب پر ماہرین تعلیم اور اساتذہ فن کی اصلاحی تجاویز پر بحث وتنقیح پر ایک مستقل جلد ہے، جو جامعہ حقانیہ میں منعقدہ وفاق المدارس کے سالانہ دوروزہ اجلاس میں اربابِ مدارس مہتممین وفاق کے تجربات کا نچوڑ ہے اور اس سے رہنمائی اس دور کی خاص ضرورت ہے۔ اس طرح نفاذِ شریعت کی تحریک میں کی گئی تقاریر ملک میں تنفیذ اسلام کے عمل کے لیے بہتر رہنمائی کریں گی، افغان جہادی زعماء کے خطبات اس صدی کے عظیم جہاد (بمقابلہ روس وامریکا) کے اہم اور خفیہ گوشے بےنقاب ہوں گے، بعض کتابوں کی رونمائی میں اربابِ علم وادب، اصحابِ صحافت وسیاست کے

ناقدانہ خیالات بصیرت افروز ثابت ہوں گے۔''

اس کتاب کی ترتیب وتدوین، توضیح وتشریح حضرت مولانا سمیع الحق دامت برکاتہم نے فرمائی ہے۔ یہ کتاب علماء، طلبہ، خطباء، مصنفین، محققین اور تاریخ سے شغف رکھنے والے احباب اور عامۃ الناس کے لیے یکساں مفید اور نایاب تحفہ ہے۔

خطاباتِ احسانی

افادات: شفیق الامت حضرت اقدس مولانا شاہ محمد فاروق نور اللہ مرقدہٗ۔ صفحات: ۱۳۲۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مکتبہ جامعۃ الابرار۔ اسٹاکسٹ: ادارۃ النور، انور مینشن، بنوری ٹاؤن، کراچی

زیرتبصرہ کتاب ''خطاباتِ احسانی'' حضرت شاہ محمد مسیح اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی تصوف کے موضوع پر خاص تصنیف ''شریعت وتصوف'' کا خلاصہ ہے، جسے حضرت شاہ محمد فاروق نور اللہ مرقدہٗ نے عصر حاضر کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز اور سہل زبان میں مجالس میں بیان فرمایا ہے۔ افادۂ عام کے لیے آپ کے خلیفہ شاہ محمد گلزار صاحبؒ نے اسے قلمبند کیا ہے۔ اس کتاب میں تزکیہ کی حقیقت، توبہ کی حقیقت، طریق کار کی حقیقت، بیعت طریقت کی حقیقت، خوف کی حقیقت، تفکر کی حقیقت، مشقت کی حقیقت، رجاء کی حقیقت، تواضع کی حقیقت، تبلیغ کی حقیقت، طریقت کی حقیقت، توکل کی حقیقت، تقویٰ کی حقیقت، صحبت کی حقیقت، اور دعا کی حقیقت، جیسے اہم مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب تزکیہ وتصوف کا گویا نچوڑ ہے۔ کتاب کا کاغذ، ٹائٹل، اور طباعت بہت ہی عمدہ ہے۔ امید ہے صاحب ذوق حضرات اس کتاب کی قدر افزائی فرمائیں گے۔

ماہنامہ ''بینات'' کی خصوصی اشاعتیں

①	حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ	350/= روپے
②	حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ	300/= روپے
③	حضرت مفتی محمد جمیل خان شہید رحمۃ اللہ علیہ	350/= روپے
④	حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری شہید رحمۃ اللہ علیہ	300/= روپے
⑤	حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہید رحمۃ اللہ علیہ	100/= روپے
⑥	حضرت مفتی عبدالمجید دین پوری شہید رحمۃ اللہ علیہ	100/= روپے

نوٹ: منی آرڈر بھیجنے والے حضرات ایک اشاعت خاص کے لیے سو روپے ڈاک خرچ بھی ہمراہ روانہ کریں۔

www.banuri.edu.pk